بسم اللہ الرحمن الرحیم

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین

"ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک چھوٹی جماعت جایا کرے تاکہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں"

فقہی اختلاف

مؤلف

شیخ التفسیر حضرت مولانا الحاج ابوالسعید

شیدہ عبدالجبار صاحب رضا قادری باقوی دامت برکاتہم

ناظم جامعۃ العلوم الشافعیہ

۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فقہی اختلاف

مؤلفہ
شیخ التفسیر حضرت العلام الحاج ابو السعید
سید شاہ عبد الجبّار قادری باقوی دامت برکاتہم
خلیفۂ اعلیٰ حضرت، مکان حضرت قطب ویلور
ناظر جامعۃ العلوم الثنائیہ۔ کڈپہ (اے پی)

ناشر
مکتبۂ ثنائیہ احاطۂ جامعۃ العلوم الثنائیہ
الماس پیٹ
کڈپہ۔ 516001

کتاب	فقہی اختلاف
مصنّف	شیخ التفسیر حضرت مولانا مولوی الحاج سیّد شاہ عبد الجبار صاحب قادری باقوی مدظلہٗ العالی
تعداد	ایک ہزار
قیمت	ساٹھ روپیے =/60 :Rs
سالِ اشاعت	۱۴۱۲ھ مطابق 1992ء
مطبع	کتب خانۂ عزیزیہ، اردو بازار، دہلی ۶
ناشر	مکتبۂ ثنائیہ۔ الماس پیٹ۔ کڈپہ (اے۔ پی)
پتہ	پرنسپال، جامعۃ العلوم الثنائیہ عربک کالج۔ الماس پیٹ کڈپہ۔ اے پی۔ 516001
کتابت	محمد شریف برکاتی۔ آمبور۔ تمل ناڈو

تقسیم کار

مکتبۂ ثنائیہ۔ جامعۃ العلوم الثنائیہ کامپلکس۔ الماس پیٹ۔ کڈپہ 516001

کتب خانۂ عزیزیہ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶

انتساب

بنام

والدین کریمین مرقدھما نور اللہ

کہ جن کی صحیح تربیت، نگہداشت اور دعاؤں نے شریعت مطہرہ پر حسب توفیق الٰہی عمل پیرا ہونے کا حوصلہ عطا فرمایا

ھدیۂ تشکر

میں اپنے مدرسۂ ثنائیہ کے بانی اور عزیز صدر عالی جناب یس۔ ثناء اللہ صاحب دام اقبالہ کا اس مرد مجاہد کا من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ والی حدیث کے پیش نظر تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جو اپنی دوسری عظیم ذمہ داریوں کے باوجود میری کتاب "فقہی اختلاف" کی طباعت کی ذمہ داری بھی لے لی ہے۔ لہذا میں دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سعادت دارین سے ہمکنار کرے۔ صحت وتندرستی، سکون واطمینان عطا فرمائے اور آپ کے اہل وعیال اور مال ومنال میں خیر وبرکت اور روز افزوں اضافہ فرمائے۔

آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم

سید عبد الجبار عفی عنہ

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مولف

اھلِ سُنّت والجماعت کا اختلاف عقائد کا ایسا اختلاف نہیں ہے۔ کہ جس میں خطا کرنے والا کافر ہو۔ فروعی مسائل کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف میں تعصب برتنا، ایک دوسرے کی توہین و تذلیل کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا سیّد شاہ عبداللطیف قادری رحمۃ اللہ علیہ "فصل الخطاب" میں رقمطراز ہیں کہ "اہل سنّت والجماعت کا اختلاف خواہ مسائل ظاہر شریعت میں ہو یا مسائل باطن شریعت میں مسلمانوں یا اہلِ کتاب کے اختلاف سا یا سُنّی یا روافض یا سُنّی و خارجی کے اختلاف سا نہیں ہے کہ جانبین ایک دوسرے کی تضلیل و تکفیر کریں بلکہ حق اس اختلاف میں دائر ہوگا۔ مجتہد و مقلد یکطرفہ فیصلہ نہیں کرسکتا۔ اگر دلیل کے پیشِ نظر ایک طرف راجح ہو بھی تو دوسری طرف کو ضال اور گمراہ نہیں سمجھنا چاہیے۔"

(فصل الخطاب: ترجمہ ص ۱۰)

شاید یہی وجہ ہو کہ ہم نے اپنے قابلِ احترام بڑے بڑے اساتذہ کو دیکھا ہے کہ علمائے دیوبند کے ساتھ بیسوں مسائل میں اختلاف ہونے کے باوجود اگر وہ باقیات صالحات، ویلور تشریف لاتے تھے تو انتہائی اخلاص کے ساتھ

اُن کا استقبال کرتے اور اُن کی تعظیم واحترام میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے تھے۔

استاذنا حضرت مفتیٔ اعظم مولانا شیخ آدمؒ نے اس وقت جب شیخ الحدیثِ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ پہلی مرتبہ باقیات صالحات تشریف لائے تھے تو مدرسہ کے خارجی دروازے پر اساتذۂ مدرسہ اور طلبۃ العلوم کی معیت میں حضرت شیخ الحدیث کا استقبال فرمایا اور انھیں پھولوں کا ہار پہنایا۔ یہ منظر صاحبِ بصیرت لوگوں کے لئے بڑا ہی معنی خیز تھا۔ جنوبی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ باقیات کے مفتی اعظم نے پھولوں کا ہار پہنایا اور شمالی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث نے ہار پہن لیا۔ قربان جائیے اس فقہی بصیرت اور رواداری پر کہ نہ اِدھر سے تذبذب نہ اُدھر سے انکار۔ یہی رویہ ہے علمائے باقیات کا علمائے کرام بریلوی کے ساتھ بھی۔ علمائے حقانی خواہ جنوبی ہند کے ہوں یا شمالی ہند کے، مشرق کے ہوں یا مغرب کے، اختلافِ مسلک کے باوجود ان میں لڑنے لڑانے کی خو نہیں تھی۔ ان لوگوں کے پاس مسلکی اختلاف اپنی جگہ پر ہوتا تھا اور آپس کی رواداری اور اتفاق واتحاد اپنی جگہ۔ چناں چہ "الفصل للوصل" کے صفحہ نمبر ۲۶۵ پر جامع نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک ملفوظ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ مصنفِ "انوارِ ساطعہ" اور بانیٔ باقیات صالحات کے استاذ بھائی سے متعلق درج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: (۱۵۱) فرمایا مولوی عبدالسمیع صاحب میرٹھ میں تھے۔ شاعری میں غالب کے شاگرد تھے۔ جب نائی خط بنانے بیٹھا تو یہ شعر پڑھا۔ شعر انھیں کا ہے یا کسی اور کا! ؎

خلاق ہر دوست ترا قطع واجب است کہ اصلاح می دہی خطِ پروردگار را

ان کے یہاں مولود شریف کا بہت اہتمام تھا۔ یہ بھی میرٹھ کی ایسی ریاست میں تھے جس میں والد صاحب تھے۔ جب میں میرٹھ میں حاضر ہوتا تھا اکثر لوگ وعظ کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ میں وعظ میں متعارف مولود شریف کا تذکرہ نکیر کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ مگر پھر بھی وہ ویسے ہی محبت و شفقت فرماتے تھے۔ ایک بار مولانا محمد قاسم صاحب میرٹھ تشریف لائے تو بعض لوگوں نے پوچھا کہ آپ مولود نہیں کرتے اور مولوی عبدالسمیع صاحب کرتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ من احب شیئاً اکثر ذکرہ: معلوم ہوتا ہے کہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبّت زیادہ ہے۔ دعا کرو مجھے بھی زیادہ ہو جائے۔

مولوی عبدالسمیع صاحب خود مجھ سے کہتے تھے۔ بھلا ایسے شخص سے کوئی کیا نزاع کرے۔ دیکھیے باوجود اختلافِ مسلک کے کیسی خصوصیت کی باتیں ایک دوسرے کے لیے کرتے تھے۔ ان لوگوں کے دل کتنے صاف تھے۔"

(الفصل للوصل : ۲۶۵)

کیا جن لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا جاگزیں ہو ان کے لیے شمال و جنوب کے ان جبال العلم کے مذکورہ واقعات اپنی اصلاح کر لینے اور مسلمانوں کو ان فروعی مسائل میں الجھانے سے بچنے کے لیے کافی نہیں ہیں۔ فاعتبروا یااولی الابصار۔

نیز فاضل بریلوی کے مصنف صـ۶۰ پر لکھتے ہیں کہ فاضل بریلوی کی تیغ تکفیر کے مقتول بھی آپ کی محبت اور عشقِ رسول ؐ کے دل سے قائل تھے۔ اور سمجھتے تھے کہ مخالفت کا اصل سبب ناموس رسول علیہ السلام کی حفاظت ہے۔ چناں چہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کہتے ہیں "میرے دل میں احمد رضا کے لیے

بے حد احترام ہے۔ وہ ہمیں کافر کہتا ہے لیکن عشقِ رسول ؐ کی بنا پر کہتا ہے کسی اور غرض سے تو نہیں کہتا۔ اختر شاہجہاں پوری (اعلیٰ حضرت کا فقہی مقام مطبوعہ لاہوری ۱۹۷۱ء)

اب چلتے چلتے دوسروں کو بدعتی اور قبر پرست وغیرہ جیسے ٹائیٹلوں سے نوازنے والے حضرات کو خاص طور پر حضرت مولانا طیب صاحب مہتمم سابق، دارالعلوم دیوبند کی تقریر کا درجِ ذیل اقتباس غور سے پڑھنا چاہیے اور پھر سوچنا بھی چاہیے آخر مباحات قسم کی چیزوں کو لے کر یہ اختلاف و تشتت، حسد و بغض کی آگ کیوں بھڑکائی جا رہی ہے۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہم دیوبندیوں اور دوسرے علماء میں اختلافِ خیال کو جس کا جی چاہے اور جہاں تک چاہے پھیلا دے حقیقت یہ ہے کہ ہم احترامِ اولیاء اور مزارات کے سلسلہ میں سب کچھ وہی کرتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں سوائے سجدہ کے۔"

(مدینہ "بجنور ۵:۹، جنوری ۵۸ء بحوالہ تجلّی" دیوبند ۵۸ء نومبر)

یہ اقتباس پڑھ کر معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا شخص بھی سمجھے گا کہ حضرت محترم فرما رہے ہیں کہ ہم زیارتِ قبور بھی کرتے ہیں، قبروں پر فاتحہ بھی پڑھتے ہیں۔ انفراداً بھی اجتماعاً بھی، قبروں پر مراقبہ بھی کرتے ہیں، قبروں کی زیارت کے لیے سفر بھی کرتے ہیں، قبروں پر تلاوتِ قرآنِ پاک بھی کرتے ہیں، قبر پر تلقین بھی پڑھتے ہیں اور قبروں پر اصحابِ قبور کے نام کے کتبے بھی لگاتے ہیں یہ ساری باتیں درست ہیں جس کا جی چاہے فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ امدادیہ دیکھ لے۔

چناں چہ ابھی اسی سال ۱۹۹۰ء کی ابتدا میں مزارات کے کتبوں کے سلسلہ میں ایک قابلِ مذمت حادثہ پیش آیا۔ آپ کی معلومات کے لیے روزنامہ

"مسلمان" مدراس ۲ کا اقتباس پیش خدمت ہے :

"دیوبند میں افسوس ناک حادثہ"

دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مذمت :

دیو بند (بذریعہ ڈاک) ۱۴؍۱۵؍ جنوری کی درمیانی رات میں کچھ ناپسندیدہ عناصر نے دیو بند اور دارالعلوم دیو بند کی پُرسکون فضا مکدر کرنے کے لیے حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند، حضرت شیخ الاسلام اور حضرت حکیم الاسلام رحمہم اللہ کے مزارات کے علاوہ قبرستانِ قاسمی میں واقع اکثر اکابر و اساتذہ کی لوحِ مزارات کو منہدم کر دیا، جس کی وجہ سے دارالعلوم اور شہر دیو بند کی فضا مکدّر ہو گئی اور پھر ایک مشتعل ہجوم نے دیگر مقامات پر توڑ پھوڑ کی کوشش کی۔ مگر اساتذہ دارالعلوم اور شہرِ دیو بند کے بااثر اور معزز لوگوں نے بروقت مداخلت کر کے حالات کو بگڑنے سے بچا لیا۔ مزارات کے ساتھ اس طرح کے توہین آمیز فعل پر حضرت مہتمم صاحب اور تمام اساتذہ نے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پُرزور مذمّت کی اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہٗ کی ہدایت پر دوبارہ کتبات کو ان کی جگہوں پر نصب کرا دیا گیا۔"

(روزنامہ "مسلمان" مدراس ۲ بروزِ جمعہ مورخہ ۶؍ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ م یکم فروری ۱۹۹۰ء

مقامی 1-2.1990)

اس تراشے کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ قبروں پر کتبات لگانے کے مسئلہ میں بریلوی مکتبۂ فکر ہو یا دیو بندی مکتبۂ فکر جنوب ہند کے عظیم الشان تعلیمی ادارے باقیات صالحات ویلور کا مسلک ایک ہی ہے۔ ایسے میں بعض حضرات کو یہ کہتے ہوئے سُن کر کہ مزارات پر کتبے لگانا بدعت ہے ناجائز و حرام ہے۔ ہم تو حیرت میں ڈوب جاتے ہیں کہ آخر یہ کس

مسلک کے ہیں اور چاہتے کیا ہیں؟ شاید ایسے ہی لوگوں کا جو عید کے دن سویاں شیر وغیرہ پکانے کو بدعت کہتے ہیں رد کرتے ہوتے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں:

"اس میں تنگی نہیں کرنی چاہیے آج کل اعتدال بہت کم ہے۔اور افراط وتفریط بہت زیادہ ہے۔ اگر خیال نہیں تو بڑی بڑی معصیتوں کا اور بدعتوں کا نہیں ہوتا اور خیال ہوتا ہے تو مباح تک پر ہاتھ صاف کرنے اور اس کو معصیت میں داخل کرنے کو تیار ہیں۔" (افاضات الیومیہ: حصۂ ششم: ص ۳۱۲) اس ارشادِ گرامی کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی جد وجہد کیجیے۔ میری غرض اس تحریر سے الحمد للہ کسی کی تنقیص نہیں ہے (بلکہ مختلف الآراء علماء کی تحریریں اور فتاویٰ ایک جگہ جمع کر کے یہ بتانا ہے کہ اختلاف آراء کے باوجود ہم نزاع کے بغیر ایک پلاٹ فارم میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔) بلکہ عہدِ حاضر میں مسلمان بھائی عقائد واصول میں نہیں فروعی مسائل اور مباحات میں اختلافات ونزاع سے آگے بڑھ کر گالی گلوچ اور مار دھاڑ پر آمادہ نظر آتے ہیں اور اپنے پسندیدہ گروہ کی تائید میں فقہی دلائل اور بڑے بڑے علمائے کرام کے فتوؤں کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں۔ کیا یہ بھائی اپنے اس رویہ سے اپنی آخرت سنوارنا چاہتے ہیں۔ یا عاقبت بگاڑ لینا؟ احقر کا گمان ہے کہ بہت سارے بھائیوں کو اپنے بزرگوں کے اصل فتاویٰ کا علم نہیں ہے؟ اگر علم ہے تو انھیں سمجھانے والوں نے جس طرح سمجھایا ہے سمجھے ہوئے ہیں، مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ لہٰذا احقر نے سوچا کہ جو کچھ اس نے بزرگوں کے فتاویٰ، مختلف آراء اور علمائے کرام کے فیصلے وغیرہ پڑھ کر سمجھا ہے اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمات

میں پیش کر دے۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ صحیح بات سمجھا دیں۔ اور جھگڑے ختم ہوں۔ یا کم از کم اختلافات اور جھگڑے کو ہوا نہ دی جائے۔

اب اخیر میں اپنے مسلمان بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ وہ راقم الحروف کی اس کتاب میں جمع کردہ مختلف فیہ مسائل کو خواہ وہ کسی بھی مکتبۂ فکر کے کیوں نہ ہوں۔ براہِ کرم انتہائی صفائی قلب کے ساتھ مطالعہ فرمائیں۔ ان کے قیود و شرائط پر خاص نظر رکھیں۔ پھر جہاں ہمارے اپنے مکتبۂ فکر کے بزرگوں اور دوسرے مکتبۂ فکر کے بزرگوں کا کسی مسئلہ میں اتفاق ہو تو براہ کرم اپنے ذاتی اغراض کے لیے اس کو عوام الناس سے چھپا کر خواہ مخواہ ان میں پھوٹ ڈالنے اور اختلافات بڑھانے کی کوشش نہ فرمائیں۔

اگر بات سمجھ میں آجائے اور آگے سے ہم جس مسئلہ پر جمے ہوئے ہیں وہ مسئلہ درست معلوم نہ ہو اور اس پر ڈٹے رہنے میں مسلمانوں کا نقصان ہوتا ہو تو دیانت داری کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اس سے رجوع کر لیں اور اس میں اپنی ہتکِ عزت نہ سمجھیں ورنہ کم از کم خاموش ہو جائیں آخر میں درخواست ہے کہ احقر کے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت اچھی سے اچھی بنائے اور تمام مسلمان بھائیوں کی بھی۔

وما علینا الا البلاغ۔

بدعت کیا ہے؟

اختلافی مسائل کے مطالعہ سے قبل آپ مختصراً یہ بھی معلوم کرلیں کہ بدعت کیا ہے ؟ تاکہ مسائل کے کما حقّہ سمجھنے میں آپ کو بصیرت حاصل رہے۔

لغت میں بدعت کے معنے ہیں (مذہب میں) نئی بات، نئی رسم نکالنا اور شرعاً بدعت کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ چناں چہ حضرت سید السادات مولانا شاہ محی الدین عبداللطیف قادریؒ "فصل الخطاب" میں لکھتے ہیں کہ

"مفہوم بدعت میں اختلاف ہے اور جمہور علماء نے بدعت کو دو قسم پر تقسیم کردیا ہے۔ ایک بدعتِ ھدیٰ جس کو بدعتِ حسنہ کہتے ہیں۔ دوسری قسم بدعت ضلالۃ ہے، جس کو بدعتِ سیئہ کہتے ہیں اور کل بدعۃ ضلالۃ (ہر بدعت ضلالت ہے) والی حدیث عام مخصوص البعض ہے۔ اور اس قاعدے کی رو سے حدیث کا معنے کل بدعۃ سیئۃ ضلالۃ (ہر نئی بات جو بُری ہو ضلالت ہے۔) ہوگا۔ اور مذکورہ حدیث کا مخصّص۔

(۱) من سنّ فی الاسلام سنّۃ حسنۃ فلہ اجرھا واجر من عمل بھا من غیران ینقص من وجورھم شیئٌ ومن سنّ فی الاسلام سنۃ سیئۃ کان علیھا وزرھو وزر من عمل بھا

من غیر ان ینقص من اوزارھم شئی :

(ترجمہ: جس نے اسلام میں نیک طریقہ نکالا اس کو اس کا اجر و ثواب ملے گا اور جو بھی شخص اس نیک طریقے پر عمل کرے گا اس کا ثواب بھی اس کو ملے گا۔ مگر دوسرے عمل کرنے والوں کے ثواب میں کسی طرح کی کمی نہ نہ ہوگی اور جو بھی شخص اسلام میں برا طریقہ نکالے گا اس کو اس کا گناہ ہوگا، اور جو بھی شخص اس بُرے طریقے پر عمل کرے گا اس کا گناہ بھی اس کو ملے گا۔ دوسروں کے گناہ میں کسی بھی کمی کے بغیر) والی حدیث ہے۔ نیز

٢ - من احدث فی امرنا ھذا مالیس منہ فھو رد

(ترجمہ: جس نے ہمارے دین میں وہ بات نکالی جو دین کی قسم سے نہیں ہے یعنی کتاب وسنّت کے مخالف ہے تو اس کی وہ بات مردود ہے) والی حدیث، اور

٣ - ومن ابتدع بدعۃ ضلالۃ لایرضاھا اللّٰہ ورسولہٗ والی حدیث ہے۔

پہلی حدیث میں امر مستحدث (دین میں نئی بات) کو حسن اچھی بات کہا گیا ہے اور

دوسری حدیث میں بدعت کے مردود ہونے کو مالیس منہ کی قید سے مقید کیا گیا ہے۔ اور

تیسری حدیث میں لفظ بدعت کی ضلالتہ کی طرف اضافت کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ مذموم و مردود بدعت ضلالت ہے نہ نفس بدعت۔ (فصل الخطاب: اخذ و ترجمہ)

فصل الخطاب میں نقل شدہ نمبر ۲ والی حدیث سے متعلق ۔
"انوار ساطعہ" کے مصنف حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رام پوری تلمیذ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رح لکھتے ہیں کہ 'شارحینِ حدیث نے لفظِ مالیس منہ کی شرح میں لکھا ہے کہ 'فیہ اشارة الی ان احداث ما لاینازع الکتاب والسنة لیس بمذموم : (ترجمہ: اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بلاشک وشبہ دین میں ایسی نئی بات نکالنا جو کتاب و سنّت کے مخالف نہ ہو برا نہیں ہے ۔) اور محدّث دہلوی رح نے لکھا ہے لفظ مالیس منہ کی شرح میں کہ مراد چیزے است کہ مخالف ومغیر دین باشد ۔ یعنی مالیس منہ سے مراد وہ چیز ہے جو دین کی مخالف اور دین کو بدل دینے والی ہو ۔
اور نواب قطب الدین خان صاحب نے ترجمہ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ مالیس منہ میں اشارہ ہے اس کی طرف کہ نکالنا اس چیز کا کہ مخالف کتاب و سنّت کے نہ ہو برا نہیں ۔ انتھی : انوار ساطعہ : ص ۳۳

بدعت پر یہ مختصر سی بات بتائی گئی ہے ۔ ان شاء اللہ تعالےٰ کتاب کے مطالب و مسائل سمجھنے میں بہت سی رکاوٹوں اور الجھنوں کو دور کر دے گی ۔

وما توفیقی الا باللہ ۔

فاتحہ اور اس کی حکمت و فضیلت

جاہلیتِ جدیدہ کے اس دور میں مسلمانوں کو اتنی فرصت کہاں ہے کہ وہ ختمِ قرآن کرکے یا کم از کم ایک یا دو پارے ہی قرآن پاک کے تلاوت کرکے اپنے بزرگوں اور عام موتی کے لیے ایصالِ ثواب کریں۔ آدمی اپنی دنیا سنوارنے میں مشغول ہے۔ اِلَّامَاشَاءَ اللّٰہ! اس لیے ہمارے بزرگوں نے، علمائے کرام نے ایصالِ ثواب کا جو طریقۂ حسنہ بتایا ہے اسے فاتحہ کہتے ہیں، اس کے لیے ہمیں اپنے بزرگوں کے شکر گذار ہونا چاہیے۔

چناں چہ حضرت مولانا عبد الشکور صاحب فاروقی رحمؒ کے فتاوی کا حوالہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بھی دیا کرتے تھے، لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب پہنچانے کو ہمارے عرف میں فاتحہ کہتے ہیں۔ (علم الفقہ)

حضرت مفتیٔ باقیات صالحات لکھتے ہیں:

"فاتحہ یعنی سورۃ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ ایصالِ ثواب کے

لیے پڑھ کر موتی کو بخشنے کو عرفِ عام میں ۔۔۔۔۔۔ فاتحہ کہتے ہیں۔ یہ عبادتِ بدنی میں داخل ہے۔ عام طور پر فاتحہ میں سورہ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور درودِ شریف پڑھا جاتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری سورتیں بھی پڑھی جاتی ہیں اور خاص طور پر احادیثِ شریفہ میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کی بہت سی فضیلتیں آئی ہیں۔

چناں چہ حضرت سید شاہ محمد قادری ویلوری مسئلہِ فاتحہ خوانی میں لکھتے ہیں:

"ابو نعیم اور دیلمی نے حضرت ابو درداء سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس قدر سورۂ فاتحہ نفع پہنچانے والی ہے اس قدر قرآن کی کوئی دوسری سورۃ نہیں۔"

امام وکیع کی تفسیر اور ابن انبادی کی کتاب "المصاحف" ابو شیخ کی کتاب "کتاب العصمہ" اور ابو نعیم کی "حلیۃ الاولیاء" میں مرقوم ہے کہ ابلیس کو اس کی زندگی میں چار مرتبہ نوحہ کرنے اور سر پہ خاک ڈالنے کا اتفاق پیش آیا۔ پہلی مرتبہ جب اس پہ لعنت ہوئی۔ دوسری مرتبہ جب اس کو آسمان سے زمین پر اُتار اگیا۔ تیسری مرتبہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اور چوتھی مرتبہ جب سورۂ فاتحہ نازل ہوئی۔

عبد ابن حمید نے اپنی مسند میں ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ سورۂ فاتحہ ثواب میں قرآنِ کریم کے دو ثلث (تین حصوں میں سے دو حصّے) کے برابر ہے۔

نیز مولانا عبد العزیز دہلویؒ نے تفسیرِ عزیزی میں سورۂ اخلاص،

(سورۂ قل ھو اللہ احد) کے فضائل میں تحریر کیا ہے کہ حدیث شریف میں اس سورت کو ثلث قرآن (قرآن کا تیسرا حصہ) قرار دیا گیا ہے۔"
(مسئلہ فاتحہ خوانی "اللطیف" ۱۴۰۹ھ ص: ۷۰)

خویش و اقارب کو حسبِ مقدور قرض لینے کے بغیر مدد کرنا خیر میں داخل ہے جس کی تائید آیت شریفہ وافعلوا الخیر لعلکم تفلحون کرتی ہے۔ کیا سورۂ فاتحہ پڑھنا خیر نہیں ہے؟ کیا ایصال ثواب کرنا خیر نہیں ہے؟

اب رہا درود شریف، جس کے متعلق اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتے ہیں: ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی یا ایھا الذین اٰمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیماً اور حدیث شریف میں ہے: من صلی علی واحداً صلی اللہ علیہ عشراً

ان تمام امور کو سامنے رکھ کر سوچئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ فاتحہ پڑھنے والے تھوڑے سے عمل کے ذریعہ ڈھیروں ثواب جمع کر رہے ہیں۔ تاہم بعض لوگ پوچھتے ہیں فاتحہ خاص وقت میں پڑھنا اور اس خاص طریقہ سے پڑھنا کون سی حدیث میں آیا ہے؟

ان بھائیوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ آدمی کوئی اچھا کام کر رہا ہو تو اس پر اس سے حدیث کا مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا یہ کام کہیں قرآن و حدیث سے ٹکراتا تو نہیں ہے؟ تاہم دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین حضرت مولانا یعقوب صاحب کا یہ بیان پڑھ لیجیے فرماتے ہیں: "اور جس حدیث میں ثواب پہنچانا مُردوں کا وارد ہوا ہے غالباً اس میں قل ھو اللہ، معوذتین اور الحمد کا پڑھنا فرمایا ہے۔ ہر چند

وہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل اعمال میں مقبول ہے"

(مکتوباتِ یعقوبی: خط بیسواں: ص ۷۷)

چلئے حضرت مولانا نے فاتحہ میں الحمد اور قل ہو اللہ شریف کو جمع کرنے پر حدیث مقبول پیش کی ہے۔ اب ان شاء اللہ وہ اعتراض باقی نہ رہے گا۔ پھر بھی کسی کا شرحِ صدر نہ ہوا ہو تو، دارالعلوم دیوبند کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیجیے:

سوال

"کوئی شخص اپنی برادری کو کسی شادی میں مقفّٰی مسجع عبارت اور اشعار کے خطوط لکھ کر بلاوے، یہ جائز ہے یا نہیں؟"

۲۔ "کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس قسم کے خطوط روانہ فرمائے ہیں؟"

الجواب

"۱ اس میں شرعاً کچھ حرج اور کچھ مواخذہ نہیں ہے۔

۲ چوں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے خطوط کو منع نہیں فرمایا، اس لیے یہ امر شرعاً درست ہے"

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، عزیز الفتاویٰ: ص: ۲۳۱۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین اور ابتدائی دور کے عظیم مفتی رہے ہیں۔ آپ کے فتویٰ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شئے کے ناجائز ہونے کے لیے صرف اس کا ذکر حدیث میں نہ ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منع کرنے کی سند چاہیے۔ غور کیجیے

کہ شادی میں مقفع و مسجع عبارت و اشعار کے خطوط ہی لکھ کر بلانا ضروری نہیں ہے۔ ایسے عمل کے لیے بھی سندِ منع کی ضرورت ہو تو پھر فاتحہ میں سورۂ فاتحہ و قل ھو اللہ شریف پڑھنا، قرآن مجید پڑھنا ہے، درود شریف پڑھنا، قرآنی آیات پر عمل کرنا ہے۔ ان کے پڑھنے میں ثواب ہی ثواب ہے۔ ہمارے لیے بھی اور ایصالِ ثواب کریں تو موتی کے لیے بھی، تو کیا ان کا ایک جگہ کرنا، بدعت و ناجائز ہونے کے لیے سندِ منع نہیں چاہیے؟ یا للعجب!!

ہمارے بعض دین دار بھائی فاتحہ کے بارے میں اتنے حساس ہو گئے ہیں کہ غیبت، جھوٹ، چغلی، ذاتی منفعت، ایذا رسانی، تفریق بین المسلمین جیسے بڑے بڑے گناہوں کو بھی بھلا بیٹھے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں اور ہمیں سچی بات سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ان کے اپنے خیال میں بس فاتحہ بدعت ہے اور فاتحہ خواں عظیم گناہ کے مرتکب ہیں۔ اس لیے اُن کے اپنے خیال میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فاتحہ نہیں پڑھی اور خاص اس طریقے سے ایصالِ ثواب نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ اگر حضورؐ نے کیا ہو تو حدیث پیش کرو۔ اگر اِن حضرات نے اس کو کلیہ بنا لیا ہے تو چلیے ہم بھی ان سے چند امور پر حدیث کا مطالبہ کرتے ہیں جن پر وہ سب کے سب بلا استثناء عامل ہیں۔ اب ان امور کی تفصیل پڑھ لیجیے اور فاتحہ کو بدعت کہنے والوں سے ان امور پر حدیث طلب کیجیے:

۱۔ سب سے پہلے نکاح کی بریانی ہی کو لیجیے، جو بے چارے دلہن والے دولھا والوں اور براتیوں کو کھلاتے ہیں۔ مسلمانوں کا بچّہ بچّہ

جانتا ہے کہ ولیمہ سنّت ہے۔ مگر نکاح کا کھانا کھلانے سے متعلق نہ ہم نے خود حدیث پڑھی ہے اور نہ ہی علمائے کرام سے سُنا ہے۔ وہ بھی کس انداز سے۔ اللہ کی پناہ! لڑکی والوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے کہ ہم پانچ سو دعوتی لائیں گے، ایک ہزار براتی آئیں گے۔ تمہیں ان سب کو کھلانا پڑیگا یہی حضرات جب خود ولیمہ کرنے لگتے ہیں، جس کو سنّت کہتے کہتے ان کی زبانیں سوکھ جاتی ہیں "بس گھر والے" کو کر لیتے ہیں۔ اب بتائیے کہ جب نکاح کا کھانا سنّت نہیں ہے تو پھر آپ کیوں کھاتے اور کھلاتے ہیں۔ اگر یہ سنّت ہے تو حدیث پیش کیجیے ؟

۲۔ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن پاک میں زیر زبر نہیں تھے۔ زیر زبر تو حجاج بن یوسف ثقفی کے حکم سے لگائے گئے تھے۔ آج آپ اس کو ضروری کیوں سمجھتے ہیں ؟ اگر آپ اس کو واجب یا سنّت سمجھتے ہوں تو حدیث پیش کیجیے ؟

۳۔ نیّت دل کا کام ہے۔ البتہ فعل القلب زبان کا کام نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سب کے سب نماز کی نیّت دل سے کرتے تھے اور آپ نماز کی نیّت زبان سے بھی کیوں کرتے ہیں ؟

کیا آپ کے نظریہ کے مطابق یہ بدعت نہیں ہے ؟

اگر سنّت ہے تو حدیث پیش کیجیے۔ !

۴۔ جمعہ اور عیدین کے خطبے میں خلفاء راشدین کے اسمائے گرامی لیتے ہیں۔ کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم لیتے تھے ؟ یا لینے کا حکم فرمایا تھا ؟ نہیں لیا تھا تو پھر آپ کیوں لیتے ہیں ؟ کیا یہ عمل آپ کے نظریئے کے مطابق

خلافِ سنّت نہیں ہے؟ اگر نہیں ہے تو حدیث پیش کیجیے!

۵۔ عیدگاہ میں منبر بنانا اور منبر پر خطبہ دینا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے تو پھر آپ عید کا خطبہ منبر پہ کیوں پڑھتے ہیں؟ کیا یہ بدعت نہیں ہے؟

۶۔ اس میں شک نہیں کہ نکاح سنّت ہے۔ مگر نکاح کی دعوت قیمتی رقعوں کے ذریعہ سے جو مقفّیٰ ومسجّع عبارتوں سے مزیّن ہوں، کیا نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی؟ نہیں دی تھی تو پھر یہ عمل خلافِ سنّت اور بدعت ٹھہرا تو پھر فاتحہ کے بدعت ہونے کا نعرہ لگانے والے بھائی اس بدعت کے مرتکب کیوں ہو رہے ہیں؟

۷۔ طوافِ رخصت میں حاجی صاحبوں کا تعظیمِ کعبۃ اللہ کے لیے کعبۃ اللہ کی طرف پیٹھ پھیرنے کے بغیر الٹے پاؤں پھرنا رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے تو حاجی صاحبان الٹے پاؤں کیوں پھرتے ہیں؟ کیا یہ بدعت نہیں ہے؟

۸۔ یہ تو کعبۃ اللہ کی بات تھی۔ مگر بزرگوں کی قبروں کے احترام میں الٹے پاؤں پھرنے سے متعلق حضرت مولانا تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: "اس حالت میں (یعنی الٹے پاؤں پھرنے سے ادب طبعی سے ہو۔ کچھ حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ ایسے عوام کے سامنے نہ ہو، جن کے تجاوز عن الحدود کا احتمال ہو۔ والسلام

(امداد الفتاویٰ جدید: ج: ۱: ص: ۷۶۵)

اب آپ ثابت کرائیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی

ایسا ہوتا تھا۔ اگر نہیں ہوتا تھا تو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی جیسی شخصیت سے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟

۹۔ آج کل صدہا مساجد میں صبح کی نماز کے بعد متصلاً خصوصیت کے ساتھ متعین طور پر تبلیغی نصاب پڑھا جاتا ہے، کیا تبلیغی نصاب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی ایسے ہی صبح کی نماز کے بعد پڑھا جاتا تھا؟ نہیں پڑھا جاتا تھا تو کیا یہ پڑھنا بدعت نہیں ہے؟ تو پھر آپ اس بدعت کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں؟

۱۰۔ کیا موجودہ نہج پر جو مدارسِ عربیہ دینیہ قائم کئے گئے ہیں اور کئے جارہے ہیں اور کلاسوں کے شروع ہونے اور ختم ہونے کی اطلاع کے لیے گھنٹی بجائی جاتی ہے، وغیرہ امور پر آپ کوئی حدیث پیش کر سکتے ہیں؟ نہیں تو کیا یہ بدعت نہیں ہے؟

تلك عشرة كاملة

اب میں آپ حضرات کی خدمات میں اتمام حجت کے طور پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک فتویٰ اور حضرت مولانا زکریا صاحب کی "شریعت وطریقت" کا ایک اقتباس پیش کر رہا ہوں تاکہ حقیقت کو سمجھنے میں آپ کو مزید مدد ملے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"اگر ہر مسئلہ میں نصِ شارع ضرور ہو تو استفتاء اور فتوے

سب گناہ ٹھہرے "

(فتاویٰ امدادیہ: ج ۴: ص ۸۹)

حضرت مولانا زکریا صاحب، مولفِ "تبلیغی نصاب" اپنی تالیف "شریعت وطریقت" میں ریاضات ومجاہدات، مثلاً ذکرِ جہری، ذکرِ یک ضربی دوضربی وغیرہ کو امراضِ روحانیہ کا علاج بتاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ:

"یہی حال بعینہٖ امراضِ روحانیہ کا ہے کہ ان امراض کے لیے روحانی اطباء جو دوائیں تجویز کریں اس پر یہ سوال کہ قرآن وحدیث سے کہاں ثابت ہے؟ حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جو لوگ اس کو بدعت کہتے ہیں وہ بدعت کی تعریف سے واقف نہیں۔

بدعت احداث فی الدین کا نام ہے احداث للدین کا نام نہیں۔ جو لوگ ان دونوں میں فرق نہیں کرسکتے وہ دین سے ناواقف ہیں۔ احداث للدین بسا اوقات ضروری بلکہ واجب تک ہوجاتا ہے۔"

شریعت وطریقت: ص ۱۴۲

ان ضروری گزارشات کے بعد آپ کی خدمات میں مختلف جلیل القدر علمائے کرام کے فتاویٰ اور ان پر تبصرے پیش کئے جارہے ہیں۔ مطالعہ کے کے بعد مسلمان بھائیوں کو ایک پلاٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش کیجیے اور راقم کے حق میں دعائے خیر۔!

الفاتحہ

ایصالِ ثواب اور فاتحہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا فتویٰ بالفاظ دیگر دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ پڑھ لیں

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ بذریعہ فاتحہ کے ثواب میت کو پہنچتا ہے یا نہیں؟ درصورت پہنچنے کے اسے معلوم بھی ہوتا ہے یا نہیں مدلل مع کتاب وسنّت تحریر فرمائیں۔

الجواب

" مذہب اہل سنّت والجماعت کا یہ ہے کہ اموات المسلمین کو ثواب عباداتِ بدنیہ وعباداتِ مالیہ پہنچتا ہے خواہ فاتحہ ہو یا کوئی خیرات وحسنات ہو۔ قال اللہ تعالیٰ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان۔ الآیہ: پس اگر دعائے احیاء اموات کے لیے نافع نہ تھی تو کیوں تعلیم کی گئی وقال اللہ لنبیہ صلی اللہ علیہ وسلم وصلّ علیہ ان صلاتک سکن لھم: پس اگر نماز جنازہ مومنین کو نافع نہ ہوتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں مامور ہوتے اور اس کو سکن کیوں فرماتے؟ وفی المشکوٰۃ عن سعد بن عبادہ قال یا رسول اللہ ان ام سعد ماتت فای الصدقۃ افضل

قال الماء فحفر بیرًا وقال هذا ہلام سعد ؛ رواہ ابوداؤد
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپؐ نے پانی کے صدقے کا ثواب
پہنچانے کا امر فرمایا۔ اگر نہ پہنچتا کیوں فرماتے۔ اور مشکوٰۃ میں
وارد ہوا ہے کہ ایک شخص کافر نے سو غلام آزاد کرنے کی وصیت
کی۔ اس کے بیٹے نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے
پوچھا: فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ لوکان مسلماً
فاعتقتم عنہ اوتصدقتم اوحججتم عنہ بلغہ ذالک
رواہ ابوداؤد۔ (یعنی آپ نے فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہوتا تو اس
کو اعتاق وصدقہ اور حج کا ثواب پہنچتا۔ فی الھدایہ من کتب
الفقہ ان الانسان لہ ان یجعل ثواب عملہ لغیرہ
صلاۃ اوصوما اوصدقۃ اوغیرہ عند اھل السنۃ و
الجماعۃ ؛ انتہی : وفی شرح عقائد النسفیہ وفی دعاء
الاحیاء للاموات وصدقتم عنھم نفع لھم خلافا للمعتزلۃ
اور روایات کثیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح اموات کو خبر بھی ہوتی
ہے کہ کس شخص نے یہ ثواب پہنچایا ہے : فی البیھقی ما المیت
فی القبر الا کالغریق المتغوث ینتظر دعوۃ تلحقہ من
اب او اخ اوصدیق فاذا لحقتہ کان احب الیہ من الدنیا
وما فیھا۔ اس حدیث سے منتظر ہونا میت کا واسطے دعا
اپنے بھائی اور دوست کے ثابت ہوتا ہے۔ پس یہ لوگ اگر ثواب
پہنچائیں گے تو ضرور اس کو شعور ہونا چاہیئے۔ ورنہ اس کا انتظار

منقطع نہ ہوگا اور اخبار و آثار بزرگان سے حدِ تواتر کو پہنچا ہے۔"

واللہ اعلم

۲۷ر جمادی الاول۔ روز پنجشنبہ ۱۳۰۳ سنہ ھج

فتاوٰی امدادیہ: ج:۴: ص: ۱۱۹

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے اس جواب سے ایک بات جو کھل کر سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ ایصال ثواب اور فاتحہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب ہے۔ معتزلہ (ایک بدمذہب فرقہ) ایصال ثواب اور فاتحہ کے منکر و مخالف ہیں۔ دوسری ایک اہم بات حدیث کے حوالے سے حضرت مولانا نے یہ بتائی ہے کہ میت کی روح اپنے باپ، بھائی اور دوست کے ایصال ثواب کے تحفے کے انتظار میں رہتی ہے۔ اور اگر ایصالِ ثواب کا یہ تحفہ باپ، بھائی، دوست یا کسی بھی ایک کی جانب سے یا سب کی جانب سے پہنچ جائے تو میت کو اس کا علم بھی ہو جاتا ہے ورنہ میت کا انتظار ختم نہیں ہوگا۔

چناں چہ فتاوٰی دارالعلوم دیوبند میں ہے: سوال: کیا میت سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تیرے فلاں عزیز یا احباب نے یہ تحفہ بھیجا ہے اور قائل اس کا کون ہوتا ہے؟

الجواب: ایسا بھی وارد ہوا ہے کہ اس سے کہا جاتا ہے اور کہنے والا فرشتہ ہوتا ہے۔

(فتاوٰی دارالعلوم: ج: ۵: ص: ۴۲۶)

معلوم ہوا کہ حدیث کی رو سے اموات اپنے رشتہ داروں اور دوست واحباب کے ایصال و ثواب کے تحفوں کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ کس قدر دکھ کی

بات ہے کہ منکرین فاتحہ وایصالِ ثواب، فاتحہ وایصالِ ثواب نہ کرکے اپنے والدین اور رشتہ داروں کو کتنے دردناک انتظار میں ڈالے رکھتے ہیں۔

یہی عقیدہ ہے علمائے باقیات کا۔ علمائے بریلوی کا اور تمام اہل السنۃ والجماعۃ کا۔

حضرت مولانا کے مذکورہ فتوی کی تائید حضرت مولانا عبد العزیز دہلویؒ کا یہ فتوٰی بھی کر رہا ہے۔ حضرت مولانا نے تفسیر عزیزی میں والقمر اذا اتسق والی آیت شریفہ کی تفسیر کے ضمن میں ارشاد فرماتے ہیں:

روایت ہے کہ مردہ اس حالت میں ڈوبنے والے آدمی کے مانند ہے جو کسی مددگار کے انتظار میں رہتا ہے۔ اور صدقات و دعائیں اور فاتحہ اس وقت بہت کام آتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ لوگوں کی مختلف جماعتیں موت سے ایک سال تک اور علی الخصوص ایک چلّہ تک اس نوعیت کی امداد میں پوری کوشش کرتے ہیں۔ انتہی

سنجیدگی سے سوچنے والے احباب کے لیے خالی الذہن بھائیوں کے لیے ایصال ثواب اور فاتحہ جائز ہونے اور اموات کے لیے بے حد مفید ہونے کو سمجھنے کے لیے ان دونوں بزرگوں کے فتاوٰی ہی بس کرتے ہیں۔ تاہم آگے پڑھیے اور فاتحہ سے متعلق تفصیلی معلومات بھی حاصل کرلیجیے تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے اور آپ پوری طرح مطمئن ہوجائیں۔

فاتحہ کس کو کہتے ہیں؟ جاننا ہو تو حضرت مولانا شاہ محمد عبد الشکور فاروقی کا یہ فتوٰی جن کے فتاوٰی کا حوالہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی بھی دیا کرتے تھے پڑھ لیجیے۔ لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب پہنچانے کو ہمارے عرف میں فاتحہ کہتے ہیں۔" (علم الفقہ: ج:۲،ص: ۲۱)

ساتھ ساتھ رسالہ "تجلّی" دیوبند کے مدیر مولانا عامر عثمانی صاحب فاضلِ دیوبند کا یہ ارشادِ گرامی بھی پڑھتے چلیے رقم طراز ہیں:

"سورۂ فاتحہ اور قل اور درود وغیرہ کا رواج فاتحہ کے نام سے ہوگیا ہے۔ اسے مستحب تو کہا جا سکتا ہے مسنون نہیں مسنون وہی چیز ہوگی جس کا انتساب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ با برکات سے ثابت ہو، معلوم ہوا کہ سنّت بس دعائے مغفرت ہے۔ اسے چاہے فاتحہ کا نام دے لیجیے چاہے اور کسی عنوان سے یاد کیجیے۔" 'تجلّی' دیوبند اکتوبر ۶۷ء ص: ۳۰

بعض لوگ فاتحہ کو بدعت اور فاتحہ پڑھنے والوں کو بدعتی کہتے تھکتے نہیں ہیں۔ چلیے ایک فاضلِ دیوبند نے فیصلہ فرمادیا کہ فاتحہ مستحب ہے جب یہ مستحب ہے اس کو بدعت کہنا؟

اور آپ یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ فاتحہ پڑھنے والے قل درود شریف پڑھ کر خاموش نہیں بیٹھ جاتے۔ لازمی طور پر موتیٰ کے لیے دعائے مغفرت کرتے ہیں تو پھر بقول مولانا عثمانی فاتحہ سنت ہوا۔ اس لیے کہ اس میں دعائے

مغفرت ہے۔ پھر لفظ فاتحہ سے کسی بھی مسلک کے کسی بھی شخص کو بدکنے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے ؟ بے علمی اور لاعلمی کی بات اور ہے۔ تاہم اگر کسی کے ذہن میں یہ بات آئے کہ اس طرح سورۂ فاتحہ اور قل ھو اللہ شریف وغیرہ پڑھنا کس حدیث میں آیا ہے؟ تو انھیں دارالعلوم دیوبند کے اسناد الاساتذہ اور صدر المدرسین حضرت مولانا یعقوب صاحب کا یہ بیان پڑھنا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

"اور جس حدیث میں ثواب پہنچانا مُردوں کا وارد ہوا ہے غالباً اس میں قل ھو اللہ، معوذتین اور الحمد کا پڑھنا فرمایا ہے۔ ہر چند وہ حدیث ضعیف ہے مگر فضائل اعمال میں مقبول ہے"۔

مکتوباتِ یعقوبی: خط بیسواں ص: ۷۷

چلیے حضرت مولانا نے حدیث بھی پیش فرمادی اور اصولی بات بھی بتادی کہ یہ حدیث قابلِ قبول بھی ہے۔ اب بھی اگر بعض بھائی قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوں تو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ ان کے عذر کو قبول فرمالے۔ اور اب فاتحہ سے متعلق ہی حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا یہ بیان بھی پڑھتے چلیے اگر آپ ان کے معتقد ہوں تو شرحِ صدر ہوجائے۔

"جب کسی کو مُردوں کو ثواب پہنچانا منظور ہو تو تب کھانا کھلانے ہی پہ موقوف نہ رکھیں۔ اگر میسر ہو تو بہتر ہے ورنہ

سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص کا ثواب سب ثوابوں سے بہتر ہے
اس کا ثواب پہنچاوے۔"

(ترجمہ صراط مستقیم : ص ۶۴)

یہ انھیں بزرگ کا فتویٰ ہے جنھیں معلوم نہیں کہ لوگ کیا کیا کہتے ہیں اور یہی شخصیت سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کے ثواب کو سب ثوابوں سے بہتر بتاتی ہے۔ پھر بھی بعض لوگ سیدھے سادے مسلمان بھائیوں کو یہ کہہ کر بدظن کر سکتے ہیں کہ حضرات مولانا نے "صراطِ مستقیم" میں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ قل ھو اللہ احد کا ذکر کیا ہے۔

متعارف فاتحہ کا ذکر کہاں ہے؟

تو اس کی سند میں آپ "صراط مستقیم" کی وہ عبارت بھی پڑھتے چلیے جو مولانائے محترم نے ذکرِ دو ضربی کا طریقہ بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

"اول طالب را باید کہ با وضو دو زانو بطور نماز بنشیند و فاتحہ بنام اکابر این طریقہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ و حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ وغیرھا خواندہ التجا بجناب حضرت ایزد پاک بتوسط این بزرگان نماید ..... ! و ذکرِ دو ضربی شروع نماید :

ترجمہ : اول طالب کو چاہیے کہ با وضو دو زانو نماز میں بیٹھے جلسہ بیٹھے اور فاتحہ اس سلسلہ کے اکابر یعنی حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ وغیرہما کے نام پر پڑھ کران بزرگوں کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں التجا کرے ..... اور ذکر دو ضربی شروع کرے ۔"

(صراطِ مستقیم : ص ۱۱۱)

اب تو ان بھائیوں کو تسلی ہو جانا چاہیے جو نادانستگی میں فاتحہ کے بدعت ہونے کے نعروں پہ نعرے لگا کر اولاد کو والدین سے، شاگردوں کو استادوں سے، مریدوں کو پیروں سے اور پبلک کو اولیا اللہ اور انبیاء علیہ السلام سے کاٹنے کی سعی فرما رہے ہیں۔ اور مسلمانوں میں تشتیت وتفریق کا باعث بن رہے ہیں۔ (حالاں کہ تفریق بین المسلمین حرام ہے۔) اب بھی کسی کو اطمینان نہ ہو تو وہ آگے بڑھیں اور قبر پہ فاتحہ میں کیا پڑھیں؟ کے سوال کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جو جواب ارشاد فرمایا ہے پڑھ ڈالیں :

" استفسار پہ فرمایا کہ کسی قبر پہ فاتحہ پڑھنے میں چند سورتیں جن کی خاص فضیلتیں آئی ہیں ان کو پڑھتا ہوں مثلاً الحمد شریف قل ھو اللہ شریف (اکثر بارہ مرتبہ کیوں کہ ایک روایت میں بارہ مرتبہ پڑھنے کی خاص فضیلت آئی ہے۔) الھٰکم التکاثر، اذا زلزلت ، سورۂ ملک ، سورۂ یٰسٓ ، قل یا ایھا الکافرون قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس ، فرمایا : قبلہ

کی طرف پشت کرکے فاتحہ پڑھنا چاہیے تاکہ مردہ کا مواجہ ہو۔"

حسن العزیز: ج اول: ص ۱۶۰)

آپ اس بات کو اچھی طرح نوٹ کرلیں کہ دیوبند کے اعلم الناس اور شیخ المشائخ نے بھی الحمد شریف، قل ھو اللہ شریف پڑھنے کو فاتحہ فرمایا ہے اور یہی نہیں آپ خود بنفسہٖ قبروں پر فاتحہ پڑھتے تھے تو ایسے میں آپ ہی سوچیے کہ کوئی طالب علم یا بے علم حنفیت اور مقلدیت کے بھیس میں فاتحہ کے بدعت ہونے اور قبر پر فاتحہ پڑھنے کو قبر پرستی ہونے کا نعرہ لگائے تو یہ نعرہ نعرۂ اللہ اکبر (اللہ سب سے بڑا ہے) ہے یا نعرۂ انا اکبر (میں سب سے بڑا ہوں) ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے اور انھیں لڑانے سے بچائے۔ آمین۔!

اس سلسلہ میں جنوبی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے مفتی حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب کا فتویٰ دیکھ لیں۔ لکھتے ہیں:

"ھو الموافق للصواب فاتحہ یعنی سورۃ الفاتحہ اور سورۃ الاخلاص وغیرہ برائے ایصالِ ثواب پڑھ کر موتیٰ کو بخشنا اور ان کے لیے مغفرت چاہنا جس کو عرفِ عام میں فاتحہ کہتے ہیں، یہ عباداتِ بدنی میں داخل ہے۔"

غیر مطبوعہ: دفتر فتاوی باقیات صالحات: ص ۷۶

حسب تصریح فتاویٰ دارالعلوم دیوبند اور فتاوی باقیات صالحات ویلور، فاتحہ کا عبادت بدنی ہونا اور جائز ہونا بلاریب و شک ثابت ہے۔ نیز مکتوبات یعقوبی میں حضرت مولانا یعقوب صاحب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

> "عوام مومنین کے مقابر میں بھی کبھی کبھی جاکر ان کو فاتحہ اور ثواب سے یاد کرو اور اپنی موت یاد کرو۔"
>
> مکتوباتِ یعقوبی ج۳: ص ۴۲

جہاں تک احقر نے حضرت محترم کی اس تحریر کا مطلب سمجھا ہے، بس یہی ہے کہ بزرگوں اور اولیاء اللہ کی مزارات پر آپ جاتے ہی رہتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہی رہتے ہیں، عوام مومنین کے مقابر پر بھی جاؤ اور اپنی موت کو یاد کرو والا جملہ خاص طور پر بتا رہا ہے، اگر عبرت حاصل نہ کروگے اور فاتحہ نہ پڑھوگے تو تمہارے مرنے کے بعد کوئی تم پر فاتحہ پڑھنے والا بھی نہ ہوگا۔ حدیث کی رو سے موتیٰ تمہارے فاتحہ و ایصالِ ثواب کے منتظر رہتے ہیں تو تمہارے مرنے کے بعد تم بھی منتظر رہوگے۔

مجھے اس مقام پر پہنچ کر وہ بات یاد آرہی ہے جو ایک دفعہ مدرسۂ سبیل الرشاد بنگلور کے دفتر اہتمام میں حضرت مولانا ابوالسعود احمد صاحب مدظلہ العالی بانی و مہتمم مدرسۂ مذکور نے ارشاد فرمائی تھی۔ اس وقت دفتر اہتمام میں میرے علاوہ حضرت مولانا محمد جعفر حسین صاحب باقوی زید مجدہم، سابق مدرس

مدرسہ باقیات صالحات اور بانیٔ باقیات کے پڑنواسے بھی موجود تھے۔ غالباً بمفتی سبیل الرشاد مولانا اشرف علی زید مجدہٗ بھی حاضر تھے۔ فاتحہ خوانی کاذکر درمیان میں آیا تو مہتمم مدرسہ سبیل الرشاد نے فرمایا:

> "میرے طالب علمی کے زمانے میں حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب باقوی القاسمی، ناظر ثالث مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کی بہن صاحبہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ اور حضرت مولانا نے طلبۃ العلوم کو تلاوتِ قرآنِ پاک کے لیے اپنے گھر پر بلوا لیا تھا۔ تلاوتِ قرآنِ مجید کے بعد حضرت ناظر صاحب نے مجھ کو فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تو میں نے الفاتحہ کہہ کر فاتحہ پڑھی تھی اور ایصال ثواب کیا تھا۔"

پہلی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب صرف فاضلِ باقیات ہی نہیں تھے بلکہ فاضلِ دیوبند بھی تھے۔ آپ کا طلبۃ العلوم کو جمع کرنکے تلاوت قرآن پاک کراکے فاتحہ خوانی کرانا دونوں مکتبۂ فکر کی نمائندگی کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حضرت مولانا ابوالسعود احمد صاحب مدظلہٗ نے الفاتحہ کہہ کر فاتحہ پڑھی تھی۔ معلوم نہیں ہے کہ بعض لوگوں کو الفاتحہ سے اتنی چڑ کیوں ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اقرؤا الفاتحہ یعنی سورہ فاتحہ پڑھو کا اختصار ہے۔

فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے:

"بخلاف عالم کے اگر اس نے مجلس میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجو یا غازی نے کہا تکبیر کہو تو ان کو ثواب ہوگا۔"
ترجمہ

ظاہر ہے کہ عرف میں الفاتحہ کہنا بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے ہے کہ سورہ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور درود شریف پڑھو اور ادھر درود شریف پڑھو کہنے پر حسب تصریح فتاویٰ عالمگیری "ثواب ہوگا" تو پھر الفاتحہ کہنا ناجائز اور بدعت کیسے ہوا؟ اتنا سا فرق تو ضرور ہے کہ بعض حضرات یہ بات عربی میں کہتے ہیں۔ تو بعض اردو میں یا اپنی زبان میں۔ میں نے خود بارہا ویلور کے وعظ کی مجلسوں میں حضرت مولانا ارشاد احمد صاحب مرحوم سفیر دارالعلوم دیوبند کو وعظ کے اختتام پر سامعین سے کہتے سنا ہے کہ ایک مرتبہ سورۂ فاتحہ تین مرتبہ سورہ اخلاص اور تین مرتبہ درود پڑھیے اور پھر دعا فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سید شاہ محمد قادری ویلوری، مفتی دارالعلوم لطیفیہ ویلور اپنے فتوٰی میں رقم طراز ہیں کہ

"اور مجلس میں ایک شخص بآواز بلند الفاتحہ کہہ کر حاضرین کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لینے میں کار خیر کی طرف رہنمائی ہے اور مسلمانوں کے اجتماع کی برکت سے اجتماعی دعا قبول ہونے کی امید ہے۔

اور حدیث شریف میں ہے الدال علی الخیر کفاعلہ خیر و بھلائی کے طرف رہ نمائی کرنے والا بھی اس خیر کو انجام دینے والے شخص کے مانند ہے۔

اب آپ مزید تشفی کے لیے حضرت مفتی دار العلوم لطیفیہ کے "مسئلہ فاتحہ خوانی" کا یہ مفید اقتباس بھی پڑھتے چلیے: اس فتویٰ پر حضرت مولانا رکن الدین سید شاہ محمد قادری ویلوری، صاحب زادہ حضرت قطب ویلور اور حضرت مولانا شاہ عبد الوہاب قادری، خلیفۂ حضرت قطب ویلور، بانیٔ مدرسۂ باقیات صالحات ویلور، حضرت مولانا عبد الحیٔ قادری واعظ بنگلور خلیفۂ حضرت قطب ویلور کے دستخط بھی ہیں۔ رقم طراز ہیں۔

"اور حضرت شیخ سعدیؒ اپنی کتاب 'بوستان' میں لکھتے ہیں'

شعر
دگر رفت و ایثار خیرش نماند
نشاید پس مرگش الحمد خواند

دوسرا شخص مرگیا اور اس کی بزرگی اور فیاضی باقی نہ رہی لہذا ایسے بخیل کی موت پر فاتحہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی مکتوبات کی جلد سوم کے ۷۴ ویں مکتوب میں فرماتے ہیں: ہر چند کہ یہ حقیر و کمترین اس قابل نہیں کہ وہ اپنے آپ کو کسی کے حق میں دعا کرنے کا اہل خیال کروں، لیکن محض بزرگوں کے نام کی برکت و تاثیر سے اور دعا قبول ہونے کی امید پر اپنے آپ کو دعا سے علیحدہ نہیں رکھتا ہوں اور زبان حال و قال سے دعا اور فاتحہ کے ذریعہ رطب اللسان رہتا ہوں ربنا

تقبل منا انك انت السمیع العلیم۔

اسی مکتوب میں رقم طراز ہیں: آپ حضرات کرام کے الطاف وعنایات سے امیدوار ہوں کہ اوقات مستجابات میں خیر وسلامتی فاتحہ اور حسنِ خاتمہ کی دعا سے یاد فرمائیں گے۔ گرامی قدر مخدوم زادوں سے بھی فقیر زادے دعا کی گذارش کرتے ہیں فاتحہ کی درخواست پیش کرتے ہیں۔

مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اپنی کتاب "الانتباہ فی سلاسل الاولیاء" میں تحریر کرتے ہیں: 'فاتحہ پڑھا اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے پکڑے ہوئے بیعت لی'۔

اسی کتاب میں "ختم خواجگانِ چشت" میں لکھتے ہیں:

'ختم خواجگان پورا کرنے کے بعد تھوڑی بہت شیرینی پر تمام بزرگوں کی ارواحِ طیبات پر فاتحہ پڑھیں اور اللہ تعالےٰ سے اپنی حاجت وضرورت کی تکمیل کے لیے دعا کریں اور اس طرح ہر روز فاتحہ اور دعا کا اہتمام کریں۔

حضرت مولانا مرزا مظہر جان جاناں شہیدؒ کے معمولات میں ہے کہ اس سلسلہ کے مشائخ کرام کی ارواح طیبات پر فاتحہ پڑھتے اور اس کے بعد ہاتھ پکڑ کر توبہ کراتے پھر خیر و برکت کے واسطے فاتحہ پڑھتے پھر کیف جس نیت اور مقصد کے تحت پڑھیں۔ پہلے ایک بار ہاتھ اٹھا کر سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے اور فاتحہ پڑھنے کے بعد اس قسم کا ثواب بزرگوں کی

کی ارواح کو پہنچانا چاہیئے۔ جس کی جانب یہ ختم منسوب ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ختم میں بھی یہی معمول ہے۔ نمازِ جمعہ کے بعد دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے بلند آواز کے ساتھ فرمایا کرتے تھے فاتحہ علی حضرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وعلی ابی بکرنا وعمرنا، عثماننا وعلینا رضی اللہ تعالی عنہم اجمعین اس کے بعد فاتحہ پڑھتے اور حاضرین بھی اس سورت کے پڑھنے میں متابعت کرتے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اپنے فتوی میں لکھتے ہیں: فقیر کے گھر تمام سال میں دو مجلسیں (مجلسِ ذکر وفاتِ شریف صلی اللہ علیہ وسلم ومجلسِ شہادتِ حسین علیہم السلام) منعقد ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ختم قرآن اور پنج آیات پڑھتے ہوئے ماحضر (شیرنی وغیرہ) پر فاتحہ پڑھی جاتی۔ یہ تمام چیزیں جس طرح کہ ذکر کی گئی ہیں اگر جائز نہ ہوتیں تو یہ فقیر ہرگز ان کو انجام نہیں دیتا۔"

فاتحہ کے بلا کراہت جائز و مستحسن ہونے پر بتائیے کہ ان علمائے محققین، صوفیاء و مشائخین جو ہندوستان کے سارے علمائے مشائخین کے کے استاذ الاساتذہ اور شیخ المشائخ ہو گزرے ہیں اور کس کے فتاوے کی ضرورت ہے؟ ضرورت تو نہیں تاہم اتمام حجت کے لیے ہندوستان کے دوسرے مفتیانِ عظام کے فتاوی بھی پڑھ ڈالیئے۔

سوال

وقت ہوتے ہی دعائے ماثورہ پڑھ کر روزہ افطار کرنے کی فضیلت آئی ہے۔ لیکن وقت ہونے کے بعد فاتحہ پڑھنا بھی از روئے ادلۂ شریعت جائز ہے یا نہیں۔؟

الجواب

"افطار کا وقت ہوجانے کے بعد فوراً روزہ افطار کرلینا افضل و بہتر ہے۔ فاتحہ پڑھنے سے آپ کا مطلب کیا ہے؟ اگر مراد ایصالِ ثواب کی غرض سے کچھ پڑھنا اور ثواب بخشنا ہے تو افطار کرلینے کے بعد بھی یہ کام ہوسکتا ہے۔"

محمد کفایت اللہ غفرلہٗ

کفایۃ المفتی: ج ۴: ص ۲۴۷

دیکھ لیجیے حضرت مفتی صاحب کی نظر میں افطار کے بعد بھی فاتحہ پڑھا جاسکتا ہے۔ تو پھر ہم جیسے بے علموں اور آپ کے پوتے شاگردوں کو بدعت ہونے کا وسوسہ کیوں ہوتا ہے؟

مولانا عبدالقدوس صاحب رومی، مفتئ شہر جامع مسجد آگرہ "دیوبند سے بریلی تک" نامی اپنی کتاب کے صفحہ نمبر ۱۳۶ پر لکھتے ہیں:

"الحمدللہ! ہم (علمائے دیوبند) فقہ حنفی کے مطابق فاتحہ (ایصال ثواب) کے بھی قائل ہیں اور نذر و نیاز کے بھی قائل ہیں

اسی طریقے پر جس طریقے پر فقہ حنفی سے اس کا ثبوت ہے۔"

یہ آگرہ کے مشہور مفتی صاحب کا بیان ہے۔ اس پر شبہ تو نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ماننے کی بات اور ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے مگر اس قسم کے مسئلوں کو بے جا چھیڑ کر انجان مسلمانوں میں تفریق کا سبب تو نہ بنیں اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی فاتحہ اور ایصال ثواب کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

"ثواب اموات کو بمذہب اہل سنّت پہنچتا ہے اور پڑھنا فاتحہ اور اخلاص وغیرہ اور اس کا ثواب بخشنا مُردوں کو موجب رفعت درجات کا ہے۔"

حررہ محمد عبدالحیؒ عفا اللہ عنہ القوی

(مجموعۂ فتاویٰ: ج ۱: ص ۸۱)

یہ ہندوستان کی سربرآوردہ شخصیت اور اپنے زمانے کے متبحر عالم اور مفتی کا ارشادِ گرامی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"فاتحہ پڑھنا موجب رفعت درجات ہے۔" کیا مانعین کو اب بھی کسی دلیل کا انتظار ہے؟

اگر انتظار ہو تو یہ مسلمانوں کی بدقسمتی ہوگی۔ اس لیے کہ ان میں انتشار پیدا کر دینے والا آتش گیر مادہ ابھی باقی ہے۔!

آخیر میں آپ حضرات مولانا خواجہ رحمت اللہؒ نائبِ رسول اللہ کے درجِ ذیل اشعار پڑھ لیں جو حضرتِ قدس سرہٗ کی تصنیف "تنبیہ النساء" میں موجود ہیں : ؎

چھوت ہے کر فاتحہ چھوڑو نکو
بندگی سے حق کے منہ موڑو نکو
فاتحہ اس گھر میں کرنا ہے روا
چھوت اس کی اس کو ہے دُسرو نکو کیا
چھوت ہے کر فاتحہ چھوڑینگی توں
مردگاں کی بددعا لیوینگی توں

خواجہ رحمت اللہؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مزارِ شریف، رحمت آباد، ضلع نلّور میں مرجع خاص و عام بنا ہوا ہے۔ آپ مشہور اولیاء اللہ میں سے ہیں۔

آپ نے فاتحہ سے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اردو ہی میں ہے خود سمجھ لیجئے۔

فاتحہ کے لئے تعینِ یوم وطعام

اس موضوع پر علمائے دین کے مفتیانِ کرام کے آراء و فتاوے کے مطالعہ سے پیشتر علمائے محققین کے اس اصول کو فراموش نہیں کرنا چاہئے۔

فرماتے ہیں:

اذا فات الشرط فات المشروط

اگر شرط فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جاتا ہے۔

تقیدات کا حال بھی یہی ہے۔ مثلاً نماز کے لیے پاکی شرط ہے۔ پاکی نہ ہو تو نماز بھی نہیں۔ اس اصول کے سمجھ لینے کے بعد اب فتاوی پڑھئیے اور یہ بات ابتدا ہی میں نوٹ کر لیجئے کہ "کسی مصلحت سے دن کا معین کر لینا شرع میں وارد ہے۔" حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے وعظ کہنے کے لیے جمعرات کا دن مقرر کر رکھا تھا اور انھوں نے فرمایا کہ حضورؐ بھی اسی طرح ہم کو وعظ فرماتے تھے۔ جیسا میں تم کو وعظ کرتا ہوں۔ (بخاری و مسلم)

سوال

گیارہویں یا توشہ کرنا جائز ہے یا نہیں اور موجب برکت بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کھانے کو مسلمان دین دار تناول فرمائیں یا نہیں؟"

(اختصاراً)

الجواب

"ایصال وثواب کی نیت سے گیارھویں یا توشہ کرنا درست ہے۔ مگر تعینِ یوم و تعین طعام کی بدعت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔ اگرچہ فاعل اس تعین کو ضروری نہیں جانتا مگر دیگر عوام کو موجب ضلالت کا ہوتا ہے۔ لہٰذا تبدیلِ یوم وطعام کرایا کرے تو پھر کوئی خدشہ نہیں۔ فقط۔

فتاویٰ رشیدیہ: ج ۱، ص ۵۳

یہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کا فتویٰ ہے۔ آپ کی سخت گیری معلوم و مشہور ہے۔ انھیں بھی حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی گیارھویں اور توشہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔ جواب کے شروع ہی میں لکھ دیا ایصالِ ثواب کی نیت سے گیارھویں شریف وتوشہ کرنا درست ہے۔ آپ کی رائے میں صرف تعینِ وقت یعنی ربیع الثانی کی گیارہ تاریخ ہی کو کی جائے درست نہیں۔ لہٰذا اگر تبدیلی یوم کرلیا جائے یعنی گیارھویں کبھی دس تاریخ کو کریں تو کبھی گیارہ تاریخ کو تو پھر کوئی خدشہ نہیں ہے۔ آپ اطمینان سے گیارہویں وتوشہ کرسکتے ہیں۔

دوسرے ایک مقام پر موتی کو ایصال ثواب درست ہے یا نہیں کے جواب میں لکھتے ہیں:۔

الجواب

"ایصال ثواب ہر روز درست اور موجبِ ثواب ہے کوئی تاریخ

و وقت سے موقت نہیں۔ اور ولادت اور روزِ وفات بھی درست ہے۔ پس اگر کسی دن کو ضروری نہ جانے بلکہ مثل دوسرے ایام ایام کے جانے ایصال ثواب میں اور کسی عوام کو بھی اس طرح کے ایصال ثواب میں ضرر نہ ہو تو کچھ حرج نہیں ہے سب کے نزدیک درست ہے'' الخ

فتاویٰ رشیدیہ: ج ۱: ص ۷۷

اس جواب سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ گیارھویں شریف گیارہ ہی تاریخ کو اور بارھویں شریف بارہ تاریخ کو ہی کی جا سکتی ہے۔

''روزِ ولادت اور روزِ وفات بھی درست ہے'' کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوگا؟

صرف شرط یہ ہے کہ تعینِ یوم کا اعتقاد نہ ہو۔ یعنی یہ اعتقاد نہ ہو کہ گیارہ تاریخ ہی کو کرنے سے ثواب پہنچے گا ورنہ نہیں، تو پھر کوئی حرج و خدشہ نہیں ہے۔

خود دار العلوم دیوبند کا فتویٰ بھی یہی بتاتا ہے۔ اگرچہ کہ فتاویٰ رشیدیہ کا شمار بھی دار العلوم دیوبند کے فتوؤں میں ہی ہوتا ہے۔

السوال

شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی گیارھویں ایصال ثواب کے لیے جائز ہے یا نہیں؟

حکیم شیخ محمد علی عفی عنہ ویلور

الجواب

"ایصال ثواب جائز ہے بشرطیکہ گیارھویں کی تخصیص نہ کرے۔" فقط

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند، امداد المفتین: ج ۵-۶ : ص ۱۹۴

استاذ محترم استاد الاساتذہ حضرت مولانا شیخ آدم رح مفتی اعظم و ناظر مدرسۂ باقیات صالحات ویلور کے فتوے سے تعینِ یوم کی بات آپ پر پوری طرح واضح ہو جائے گی۔

سوال

تیجا، دسواں، بیسواں، چالیسواں، برسی مُردے کی نجات سمجھ کر کرنا کیسا ہے؟

الجواب

"احیاء کے عبادات مالی و بدنی کا ثواب موتیٰ کو پہنچنا اہلِ سنّت کے پاس جائز ہے۔ ردالمختار میں ہے:

وفی البحر من صام او صلی او تصدق وجعل ثوابه لغیره من الاموات والاحیاء جاز ویصل ثوابها الیهم عند اهل السنته والجماعة : انتهی

بنا براں مختلف اوقات میں۔ بلا تعین یعنی فلاں فلاں وقت میں ہی یہ کام کرنا موجب ثواب ہے ورنہ نہیں۔ اس قسم کا عقیدہ نہ رکھ کر کرنا منع نہ ہوگا۔ اس قسم کا عقیدہ نہ رکھنے کی یہ علامت ہے

ہے کہ ان مقررہ دنوں میں کسی وجہ سے نہ کریں تو دل میں کسی قسم کا خلجان و تشکک پیدا نہ ہو۔"

کتبہ شیخ آدم عفی عنہ دفترِ فتاوی شیخنا: ص ۲۵: غیر مطبوعہ

الجواب صحیح: محمد عبدالجبار عفی عنہ: صدر المدرسین باقیات۔

اس کے ساتھ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ بھی پڑھ لیجیے:

سوال

کیا موے ہوئے کے نام دہم، بستم و چہلم کی فاتحہ کرنا ضروری ہے؟

جواب

"ایصال ثواب تو مستحسن ہے لیکن دہم، بستم و چہلم وغیرہ لازمی نہیں۔ حسبِ وسعت جب ہو سکے صدقہ کر کے میت کو ثواب بخش دیا جائے۔"

کفایۃ المفتی: ج ۴: ص ۵۶

جوابات واضح طور پر بتا رہے ہیں کہ دہم، بستم، چہلم وغیرہ لازمی سمجھنا یعنی انہیں تاریخوں میں فاتحہ کرنا لازم ہے سمجھ کر کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اگر لازمی نہ سمجھیں تو پھر درست ہے۔ اس لیے کہ ایصالِ ثواب مستحسن ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسنات حافظ محمد عبدالجبار صاحبؒ حنفی ویلوری پر لوگوں نے وہابی ہونے کا الزام لگایا تو آپ نے ایک رسالہ "ھدایت اللبیت"

کے نام سے لکھ کر اپنے وہابی ہونے کی تردید کی، جیسے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح نے "الشہاب الثاقب" لکھ کر علمائے دیوبند کے وہابی ہونے کی تردید کی ہے۔

مولانائے موصوف "ھدایت اللبیب" میں لکھتے ہیں:

سوال (۴)

(سوم، دہم، بستم چہلم سے متعلق)

> "الجواب: مذکور فاتحہ کرنے سے میں نے کسی کو منع نہیں کیا ہے اور ایسی کئی دعوتوں میں شریک ہو کر شوق سے تناول طعام کیا ہوں۔ خود اپنے والد ماجد کی زیارت تیسرے دن کیا ہوں۔ مسجد مکانِ حضرت قطبِ ویلور میں۔ مگر بات یہ ہے کہ لوگ تعین فاتحہ سنّت اور واجب جانتے ہیں۔ بلا تعین کرنے میں عدم ثواب جانتے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ ایسا عقیدہ نہیں رکھنا چاہیے۔"
>
> ہدایت اللبیب: ص ۳۲، سنہ ۱۳۴۲ھ

بات وہی ہوئی جو دیوبند اور باقیات صالحات وغیرہ کے علمائے کرام نے ارشاد فرمائی ہے۔ آپ فاتحہ کے بارے میں شمال وجنوب کے بڑے بڑے علمائے کرام کے فتوی پڑھ چکے ہیں اگر آپ ضرورت محسوس کریں تو براہِ کرم مذکورہ فتاوے اور ان کے تبصروں پر ایک نظر ڈال لیں اور کسی بھی فریق کی طرف

جھکاؤ کے بغیر اپنے ضمیر سے فیصلہ طلب کریں کہ فاتحہ قبر پہ ہو یا گھر پہ مسجد میں ہو یا اور کسی مقام پہ، نیز فتویٰ حضرت مولانا شیخ آدمؒ ویلوری کا ہو یا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا ہو یا حضرت مولانا احمد رضا خان صاحبؒ کا، حضرت مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کا ہو حضرت مولانا عبدالعزیز دہلویؒ کا اور فاتحہ سوم کے ہوں یا دسویں، بیسویں کے، چہلم کے ہوں یا ششماہی و برسی کے، گیارھویں کے ہوں یا بارھویں کے مذکورہ بزرگ مفتیوں میں سے کسی بھی بزرگ نے حرام یا ناجائز کم از کم مکروہ کہا ہے؟ نہیں! اور جن بزرگوں نے بدعت کو بھی ہے تو فاتحہ کے لیے تعینِ وقت کو بدعت کہا ہے۔ فاتحہ کو نہیں اگر تعین وقت کا اعتقاد نہیں ہے تو پھر کوئی بھی خدشہ نہیں کہا ہے اور اب خدارا اپنے تجربوں اور مشاہدوں کو کام میں لائے اور آج کل ہونے والے فاتحوں کا جائزہ لیجیے اور بتائیے کیا نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارھویں کے فاتحہ اور حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کی گیارھویں کے فاتحہ ربیع الاول کی بارھویں تاریخ یا ربیع الثانی کی گیارھویں تاریخ تو کجا ماہ ربیع الاول اور ربیع الثانی ہی سے آگے گزر کر رجب، شعبان وغیرہ میں نہیں ہو رہے ہیں؟ اگر ہو رہے ہیں اور یقیناً ہو رہے ہیں تو پھر تعین وقت کی گرہ لگا کر فاتحہ کو بدعت ثابت کرانے کی کوشش کم فہمی کی دلیل ہی ہو سکتی ہے۔

اب سوچیے کہ جب فاتحہ بدعت نہیں ہے اور اس میں تعین وقت بھی نہیں ہے یہ بدعت کیا ہوتے مستحب بلکہ سنّت ہے تو اس کو بدعت و ناجائز بتا بتا کر مسلمانوں میں پھوٹ کیوں ڈالی جارہی ہے۔ ایسا

کرنے والے حضرات آخر چاہتے کیا ہیں ؟

الحمد للہ ! آپ عقل مند ہیں غور کیجئے !

مزید وضاحت کے لیے حضرت مولانا شاہ محمد عبد الشکور صاحب فاروقی کے فتوے پر جن کے فتاوی کا حوالہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ بھی دیا کرتے تھے ، ایک نظر ڈال لیجئے ۔!

"مسئلہ :۔ ایصال ثواب کے لیے دن اور تاریخ کا مقرر کرنا جیسا کہ ہمارے زمانے میں رائج ہے ، تیجہ ، دسواں ، بیسواں چالیسواں ، شش ماہی ، برسی محض بے اصل ہے ۔ لیکن اگر اس تقرر تاریخ سے کوئی غرض صحیح متعلق ہو تو پھر بے جا نہ ہوگا مثلاً اس کام کا وقت مقرر کر لینے سے کام اچھا اور انتظام و اطمینان سے ہوتا ہے ۔ جیسا کہ صحابہؓ نے قرآن مجید کی تلاوت کا وقت مقرر کر لیا تھا یا یہ غرض ہو کہ وقت مقرر ہو جانے سے لوگوں کے بلانے کی زحمت نہ اٹھانا پڑے گی اور لوگوں کے جمع ہونے کی ضرورت رہا کرتی ہے ۔ اور بے کسی غرض صحیح کے ناجائز ہے ۔"

علم الفقہ : ج ۲ : ص ۲۱۳

ممکن ہے کہ مسئلہ کے آخری جملے " اور بے کسی غرض صحیح کے ناجائز ہے" سے کسی کو دھوکہ ہو جائے کہ فاتحہ کو ناجائز کہا گیا ہے ۔ جی نہیں ! بلکہ غلط عقیدہ

کے ساتھ تعین وقت کو ناجائز کہا گیا ہے۔ غرض صحیح ہو تو فاتحہ کے لیے تعین وقت بھی بلاشک وشبہ جائز ہے۔ حضرت مولانا سید شاہ محمد قادری ویلوری کے بھانجے داماد اور مفتی مدرسۂ لطیفیہ، ویلور فاتحہ ہی سے متعلق ایک طویل فتوی میں رقم طراز ہیں:

"فاتحہ کے اندر تعینِ اوقات بنیّتِ خیر ہے تو اس کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔ التزام ناجائز کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کو لازم اور ضروری خیال کریں۔ اور کبھی اس کو ترک نہ کریں یا تعین ہی میں حصول ثواب یا زیادتی ثواب سمجھیں اور ترک کرنے میں عدم ثواب یا ثواب میں نقصان یا کمی سمجھیں مثلاً کسی شخص کے انتقال کے تیسرے دن دعائے مغفرت دوسرے یا چوتھے دن یا کسی بھی دن ہو اس کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن یہ لازم کرلینا اور ضروری سمجھ بیٹھنا کہ انتقال کے تیسرے دن ہی زیارت کرنا چاہیئے اس سے قبل یا بعد نہیں کرسکتے یا ثواب نہیں ہوگا یہ چیز ناجائز ہے۔"

اقتباس از "مسئلہ فاتحہ خوانی"

اس فتوی پر جنوبی ہند کے نو مشاہیر علمائے متبحّر کے دستخط ثبت ہیں۔ جس میں سے تین علمائے کرام کے نام ان کی آرار کے ساتھ درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولانا رکن الدین محمد شاہ قادری ویلوری

جوابِ ھٰذا صحیح ہے۔

۲۔ (حضرت) مولانا شاہ عبدالوہاب قادریؒ خلیفہ قطب ویلور

بانی مدرسہ باقیات صالحات ویلور

یہ جواب صحیح ہے اور درست ہے اور اس مسئلہ میں جھگڑا کرنے والا بے شک غلطی پر ہے۔

۳۔ حضرت مولانا عبدالحیٔ قادری واعظ بنگلوری

اس جواب کے صحیح ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔

آپ مذکورہ فتاوی پڑھ لیے ہیں اور آپ کو معلوم بھی ہو چکا ہے کہ جنوبی ہند اور شمالی ہند کے پورے علمائے کرام اس پر متفق ہیں کہ غرض صحیح کے ساتھ اعتقادِ مذکور کے بغیر تعین یوم درست ہے تو پھر ہم آپس میں کیوں مجادلوں اور مکابروں کا بازار گرم کریں؟

اگر ہمارے بھائیوں میں سے کسی کو اب بھی اصرار ہو کہ سوم، دسواں، بیسواں وغیرہ کرنے والوں کی نیت صحیح نہیں ہوتی تو گستاخی معاف آپ غیب دان ہونے کا بڑا ہی خطرناک دعویٰ کر رہے ہیں۔ ان کے دل کی حالت آپ کو کیسے معلوم ہو گی؟

اگر آپ نے ان کے ظاہری اعمال سے اس کا اندازہ لگایا ہو تو میرے عزیز بھائی اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ آپ ایصال ثواب جیسے مسنون کام ہی سے روک دیں اور سنّت پر عمل کرنے نہ دیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہی ہوئی کہ آپ زیارتِ قبور سے جو سنّت ہے لوگوں کو شد و مد کے ساتھ

روکنے لگیں۔ کوئی اعتراض کریں تو آپ انتہائی سادگی کے ساتھ کہہ دیں کہ لوگ زیارتِ قبور کے لیے جاکر قبروں پر سجدے کرتے ہیں، اس لیے روکتا ہوں۔ ایسی صورت میں آپ کی ذمہ داری ہوجاتی ہے کہ آپ لوگوں کو بتائیں کہ حرام کیا ہے حلال کیا ہے؟ سنّت کیا ہے؟ اور بدعت کیا ہے! یہاں پر پہنچ کر شمالی ہند کے ایک مشہور عالم حضرت مولانا شاہ عبدالشکور صاحب فاروقی کا ایک فتویٰ پیش کردینا انتہائی درجہ برمحل ہوگا۔ فرماتے ہیں:

> "زیارت قبور کا محض اس خیال سے ترک کردینا کہ وہاں عوام لوگ بدعت و شرک کی باتیں مثل طوافِ قبور اور سجدۂ قبور وغیرہ وغیرہ کی کرتے ہیں یا نامحرم عورتیں وغیرہ وہاں جمع ہوتی ہیں نہ چاہیئے بلکہ ایسی حالتوں میں انسان کو لازم ہے کہ ان امور کو حتیٰ الامکان روکے اور زیارتِ قبور سے باز نہ رہے۔ (ردالمختار بحرالرائق)
>
> علم الفقہ: ج ۲ : ص ۲۱۵

کاش کہ ہم صرف باتیں بنانے، بحثیں کرنے کے حضرت موصوف کی ہدایت پر عمل کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا کرلیتے اور حکمت و موعظت حسنہ کے ذریعہ اپنے دینی بھائیوں کی خدمت کرتے! لیکن سر سے کفن کون باندھے؟

اب آپ آخر میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحؒ کا فتویٰ بھی پڑھ لیں، جو حضرت مولانا قاسم نانوتوی بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحؒ کے پیر و مرشد ہیں۔ (فیصلۂ ہفت مسئلہ) میں تحریر فرماتے ہیں کہ

> "مقصود ایجادِ عرس سے یہ تھا کہ سب سلسلہ کے لوگ ایک تاریخ میں جمع ہو جائیں، باہم ملاقات ہو جائے، اور صاحبِ قبر کی روح کو قرآن و طعام کا ثواب بھی پہنچایا جاوے یہ ہے مصلحت تعینِ وقت میں۔"
>
> بہت خوب بات ہے
>
> 'فیصلۂ ہفت مسئلہ'

دُعا و فاتحہ بعدِ نماز

نماز کے بعد فاتحہ وایصالِ ثواب کا مسئلہ بھی بڑا ہی معرکتہ آلارا مسئلہ بن گیا ہے۔ ابھی ماضیٔ قریب میں بعض بھائیوں کو اپنے اپنے شہر کے علمائے کرام اور اپنے اساتذۂ عظام کے علی الرغم القا رہوا ہے کہ فاتحہ بعد نماز بدعتِ سیئہ ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ خواہ یہ بھائی دیوبندی مکتبۂ فکر کے ہوں یا باقیاتِ صالحات کے یا اور کسی بھی مکتبۂ فکر کے، مگر یہ حضرات ان دونوں اداروں کے فتاوی سے شاید واقف نہیں ہیں یا واقف ہیں تاہم نعرۂ بدعت بلند کر رہے ہیں تو ان کی غرض کچھ بھی ہو، ہمیں اس سے بحث نہیں۔ لیکن ان سے ضرور درخواست کریں گے کہ مباحات قسم کے مسائل کو لے کر براہِ کرم مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام ہرگز ہرگز انجام نہ دیں۔ جو سخت حرام ہے۔ اگر پھر بھی نہ مانیں تو ہمارے بس میں ہے ہی کیا سوائے دُعائے خیر کے۔!

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب آپ تفصیلی بات معلوم کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

ہم نے احادیث شریفہ میں پڑھا ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر نماز کے بعد قرآنِ مجید کی مختلف سورتیں پڑھنے کا حکم فرمایا ہے۔ چناں چہ

"شرحِ سفر السعادت" میں لکھا ہے کہ عقبہ بن عامر روایت کرد وگفت امرنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اقرأ بالمعوذات فی دبر کل صلاۃ۔

(شرح سفر السعادت : ص ۱۱۶)

صاحبِ کتاب نے لکھا ہے کہ بعض علماء کے پاس معوّذات سے مراد قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ بربّ النّاس، سورۂ اخلاص اور سورہ الکافرون ہے۔ اس کے ساتھ آپ اس بات کو بھی نظر انداز نہ کریں کہ احادیثِ شریفہ سے ثابت ہے کہ ذکرِ خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ چناں چہ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے کسی صاحب کے اس سوال پر کسی مصیبت کے وقت بخاری شریف کا ختم کرانا قرونِ ثلاثہ سے ثابت ہے یا نہیں؟ اور بدعت ہے یا نہیں؟ کے جواب میں رقم طراز ہیں:

> **الجواب**
>
> "قرونِ ثلاثہ میں بخاری تالیف نہیں ہوئی تھی، مگر اس کا ختم درست ہے کہ ذکرِ خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے اس کی اصل شرع سے ثابت ہے بدعت نہیں۔" فقط
>
> فتاوی رشیدیہ ج ۱ : ص ۱۱

آپ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے کہ بخاری شریف صحابہؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانہ میں تالیف ہی نہیں ہوئی تھی اور صحابہؓ وغیرہ میں سے کسی نے ختم بھی نہیں کیا تھا، کریں گے بھی کیوں کر؟ تاہم ختمِ بخاری شریف بدعت

نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کی اصل شرع سے ثابت ہے۔ اور یہی اصولی بات ہے۔ اور آپ اس بات کو بھی نہ بھولیں کہ ختم بخاری شریف جیسا ذکرِ خیر ہے ویسا ہی ایک دو حدیثوں کا پڑھنا بھی ذکرِ خیر ہے۔ نیز ختم قرآنِ شریف کرنا بھی ذکرِ خیر ہے تو پھر معوذتین، سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھنے کے بعد دعا کیوں قبول نہیں ہوگی؟ ان شاء اللہ ضرور قبول ہوگی تو پھر نماز کے بعد فاتحہ سے روکا کیوں جائے۔ پڑھنے والے شوق سے پڑھیں۔ چناں چہ بعد نمازِ جنازہ بھی فاتحہ اور دعا سے متعلق دارالعلوم دیوبند کا یہ فتوے ملاحظہ فرمائیں:

السوال

بعد نمازِ جنازہ قبلِ دفن چند مصلّیوں کا سورۂ فاتحہ ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار آہستہ آواز سے پڑھنا اور امام جنازہ یا کسی نیک آدمی کا دونوں ہاتھ اٹھا کر مختصر دعا کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

"اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ لیکن اس کو رسم کرلینا اور التزام کرنا مثل واجبات کے اس کو بدعت بنادے گا: کما صرح به الفقهاء" فقط

فتاویٰ دارالعلوم: ج ۵: ص ۴۳۴

ماحصل یہ ہوا کہ سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص وغیرہ کا پڑھنا ذکرِ خیر ہے اور ذکرِ خیر کے بعد دعا قبول ہوتی ہے۔ لہٰذا اس میں کچھ حرج نہیں شرط یہ ہے کہ آپ اس کو لازم نہ سمجھیں۔ بعد نماز جنازہ فاتحہ کا رواج بہت کم ہے۔ اگر لازم سمجھا گیا ہوتا

تو ہر نمازِ جنازہ کے بعد ہر جگہ یہ عمل جاری رہتا۔ اگر کوئی ایسا سمجھیں بھی تو انھیں سمجھانا علمائے کرام کا کام ہے۔ دوسروں کا اس کو بدعت ہے نا جائز ہے کہ کر فتنہ مچانا نہیں چاہیئے اس مقام پر مولانا عامر عثمانی، فاضلِ دیو بند کا یہ بیان بھی پڑھ لیں۔ لکھتے ہیں کہ "کسی فعل مباح کو معمول بنانا بدعت نہیں ہوگا۔ جب کہ اسے بجائے خود عبادت تصوّر نہیں کیا جاتا۔ یہ کلّیہ درست نہیں ہے کہ ہر فعل مستحب پر دوام و استمرار منع ہے۔ رمضان میں وتر کی جماعت مستحب ہے۔ لیکن آپ دیکھتے ہی ہیں کہ ترک پر عمل نہیں کیا جاتا۔ بلکہ ہر رمضان میں التزاماً جماعت ہوتی ہے۔ کسی فقیہ نے نہیں کہا کہ اسے گاہے ماہے ترک کرتے رہنا چاہیے"

("تجلّی" دیو بند: ص ۳۷: آگست ۱۹۶۷ء)

دار العلوم کا مذکور فتویٰ ہی نہیں بلکہ ابھی ماضیٔ قریب میں مطلقاً نماز کے بعد ایصالِ ثواب کے جائز ہونے سے متعلق ایک فتویٰ دار العلوم کے دار الافتاء سے نکلا ہے۔ آپ کے معلومات میں اضافہ کے لیئے درجِ ذیل ہے:

سوال

نماز کے بعد جہراً دعا کرنا کیسا ہے؟ نیز سورۂ فاتحہ وغیرہ دعائیں پڑھ کر ایصالِ ثواب کرنا اور اس کو معمول بنا لینا کیسا ہے؟ وضاحت مطلوب ہے

المستفتی: محمد طیب غفرلہٗ سہارنپوری مقیم بنگلور سٹی

معرفت عبد اللہ اعظمی متعلم دار الافتاء دار العلوم دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق

"دعا آہستہ مانگنا چاہیے یہی افضل ہے بقولہ علیہ السلام

خیر الذکر الخفی. نیز جہراً بھی جائز ہے اور حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ عن ابن الزبیر کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سلم من صلاتہ قال بصوتہ الاعلیٰ لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ

طحطاوی علی المراقی: ص ۱۷۴

دعا میں ایصال ثواب کے لیے خواہ اپنے لیے ہو سورہ یا کسی بھی قرآنی آیت کا پڑھنا جائز ہے بلکہ مستحسن ہے اور ہر وقت بجز حالتِ جنابت کے قرآن کا پڑھنا درست ہے لہٰذا معمول بنا لینے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ بلکہ پسندیدہ ہے۔ الذین یذکرون اللہ قیاماً وقعوداً وعلی جنوبھم الآیۃ؛ اس کی دلیل ہے:

العبد نظام الدین	الجواب صحیح
مفتیٔ دارالعلوم دیوبند	ظفیرالدین
۹-۱-۱۴۰۷ھ	مفتیٔ دارالعلوم
	دیوبند

عام طور پر محبین دارالعلوم دیوبند کی نگاہیں ہر مسئلہ میں دارالعلوم کے دارالافتاء پر لگی رہتی ہیں۔ محبین باقیات صالحات ویلور کی نگاہ باقیات کے دارالافتاء پر۔

چلیے دارالعلوم کے دارالافتاء نے فیصلہ کر دیا کہ نماز کے بعد دعا میں ایصالِ ثواب کے لیے سورۂ فاتحہ یا کسی بھی قرآنی آیت کا پڑھنا جائز ہی نہیں

بلکہ مستحسن ہے۔ اور معمول بنالینے میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اب آپ باقیات صالحات کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمالیں:

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس باب میں کہ رانی پیٹ کی ایک مسجد میں بعد نمازِ صبح امام و مقتدیان تمام تھوڑا وقت بیٹھ کر تسبیح و تحمید و تکبیر وغیرہ اذکار پڑھ کر امام کی دعا کے اخیر میں سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک پہ فاتحہ پڑھ کر نکلتے وقت آپس میں مصافحہ کرنے کی عادت چلی آتی تھی اور رہے دس پندرہ روز کے قبل رائے ورگ والے سید اسمٰعیل صاحب نامی ایک مولوی صاحب (جن کے ماتحت ایک مدرسہ ہے۔ اس کے اخراجات کے لیے پیسہ وصول کرتے آنے کی خبر ہے) آکر اس مصافحہ اور فاتحہ کو ناجائز قرار دے کر چلا گئے تب سے بعض لوگ اس کو منع کرنے پر اور اکثر اس کو جاری رکھنے پر مصر ہیں۔ رفتہ رفتہ (مبادا) بستی میں پھوٹ پڑنے کا اندیشہ ہے۔ شرعاً اس کا کیا حکم ہے۔ بینوا و توجروا سائل

سید محی الدین۔

پنشن حوالدار نمبر مکان ۵ مدراس ٹرنک روڈ رانی پیٹ

الجواب

"ھوالموفق اگرچہ مصافحہ عند اللسقار یعنی دو آدمی ملتے وقت سنّت ہے وہ شرعاً ممنوع فعل نہیں۔ بلکہ مومنوں کے مابین کی شکر رنجی اور عداوت کو دور کرنے والا ہے۔ اور بعد نمازِ عید یا بعد نمازِ جمعہ یا بعد نمازِ صبح وغیرہا میں مصافحہ کرنے کی عادت ہو

اور اس کو سنّت یا واجب اعتقاد نہ رکھے ہوں تو اوقاتِ مذکورہ میں مصافحہ منع نہیں مباح و جائز ہے۔ ہاں! اس کو واجب و لازم سمجھنا برا ہے۔ اسی طرح اس کو حرام سمجھنا بھی خطا اور غلط ہے۔ بدستور سرورِ عالم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم و دیگر انبیاء کرام و اولیاء عظام وغیرہم مومنین و مومنات کے لیے فاتحہ یعنی قرآنِ شریف و دیگر کلمات طیبات پڑھ کر یا صدقات وغیرہ کر کر اس کا ثواب ان کی ارواح مقدسہ کو پہنچے دربارِ الٰہی میں دعا کرنا شرعًا منع نہیں۔ ہاں! اس کو لازم و واجب سمجھنا منع ہے الخ...

کتبہ شیخ آدم عفی عنہ

الجواب صحیح: محمد حسن باشاہ عفی عنہ

صحّ الجواب: محمد ابوبکر عفی عنہ ۱۶ ستمبر ۱۹۴۸ء

صحیح الجواب واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

سید محمد سعید کان اللہ لہ

(نقل از دفتر فتاوی شیخنا: ص ۱۴-۱۵۔ از ۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۱ء)

باقیات صالحات کے مفتی اعظمؒ نے بھی نماز کے بعد فاتحہ و ایصال ثواب کو شرعًا منع نہیں فرمایا ہے۔ لیکن واجب و لازم سمجھنے سے منع فرمایا ہے۔ الحمد للہ! واجب و لازم علمائے کرام اور پڑھے لکھے لوگ تو نہیں سمجھتے البتہ عوام الناس سے کوئی ایسا اعتقاد کرلے تو ان کو سمجھانا آپ کا ذمہ ہے ●

دعا و فاتحہ بعد نمازِ جنازہ

ہم نمازِ جنازہ کے بعد دعا و فاتحہ پڑھنے میں بھی اختلاف رکھتے ہیں اختلاف اختلاف کی حد تک ہوتا تو برا نہیں تھا۔ یہ اختلاف خلاف کے دائرہ میں پہنچ چکا ہے۔ حالاں کہ بزرگوں کے فتاویٰ میں جواز کے صرف اشارے ہی نہیں وضاحتیں ملتی ہیں تو پھر ہمیں جھگڑنے کی ضرورت کیا ہے؟ چلیے اب آپ مفتیانِ کرام کے فتاویٰ ملاحظہ فرمالیجیے۔ تاکہ حقیقت آپ پر واضح ہوجائے۔

بانیٔ باقیات صالحات ویلور، نمازِ جنازہ کے بعد میت کے سرہانے اور پائنتی سورۂ بقر کی بعض آیتیں پڑھنے اور دعا کرنے سے متعلق سوال کے جواب میں لکھتے ہیں، جواب کا اختصار پیشِ خدمت ہے۔ تفصیل معلوم کرنا ہو تو اصل ملاحظہ فرمالیجیے:

الجواب

"نماز جنازہ کے بعد میت کے سر طرف سورۂ بقر کی شروع کی آیتاں الٓمٓ سے مفلحون تک اور پاؤں کی طرف سورہ کے آخیر کی آیتاں امن الرسول آخر تک پڑھنا مستحب ہے اور

بعض حدیثوں میں اس کو بعد دفن کے پڑھنا مذکور ہے جیسا کہ "مفتاح الصلاۃ" میں لکھا ہے۔ "چوں از نماز فارغ شوند مستحب است کہ امام یا صالح دیگر فاتحۂ بقرہ تا مفلحون طرفِ سر جنازہ و خاتمہ بقرہ یعنی اٰمن الرسول طرف پائین بخواند کہ در حدیث وارد است و در بعض احادیث بعد از دفن واقع شدہ ہر دو وقت کے میسر شود مجوز است۔" انتہی ......،

بعد نماز جنازہ کے بعض دعاؤں کا پڑھنا بھی ثابت ہے۔ چنانچہ "زاد الآخرہ" میں لکھا ہے کہ "در بحر زخار گفتہ بعد سلام بخوانید" اللّٰھم لا تحرمنا اجرہ ولا تفتنا بعدہٗ وغفرلنا ولہٗ اور اس میں بر منز یعنی فتح القدیر لکھا ہے۔ "و در روایتے است کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بر مردہ نماز گزارد پس بگفت اللّٰھم ان فلان ابن فلاں فی ذمتک دخل فی جوارک فقہ من فتنۃ القبر وعذاب النار وانت اھل الوفاء والحق اللّٰھم اغفرلہٗ وارحمہٗ انک انت الغفور الرحیم و در روایتے است کہ آں حضرتؐ ایں دعا را می خواند: اللّٰھم انت ربھا وانت خلقتھا وانت ارزقتھا و انت ھدیتھا الی الاسلام وانت قبضت روحھا وانت اعلم سرھا وعلی نیتھا جئنا شفعاء فاغفرلھا وارحمھا انک انت الغفور الرحیم۔ انتہی ....

فقط واللہ اعلم بالصواب

کتبہ عبدالوہاب کان اللہ تعالیٰ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد عبدالجبار عفی عنہ	محمد عبدالعزیز	شیخ آدم عفی عنہ
المجیب	الجواب صحیح	
محمد یعقوب عفی عنہ	عبدالسلام عفی عنہ	

(غیر مطبوعہ دفترِ فتاوی اعلیٰحضرت بانی باقیات ۔ ص ۱۶۹)

آپ نے پڑھ لیا ہے کہ بانیٔ باقیات نے جنازے کی نماز کے بعد دعا کے ثبوت میں تین کتابوں کا حوالہ دیا ہے۔ "زاد الآخرۃ" "بحر ذخائر" اور "فتح القدیر" اور یہ نزاع ختم کرنے کے لیئے کافی ہے ۔ اس لیئے کہ اس میں جیّد علمائے کرام کے دستخط بھی موجود ہیں ۔ جو استاذ العلماء کہلاتے ہیں ۔ پھر بھی کسی کا دل مطمئن نہ ہو تو کیا اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کی بجائے مسلمانوں کو جھگڑوں سے بچانے کے لیے سکوت اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ آپ ہی سوچیئے :

اطمینان کے لیے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتوے جو درحقیقت دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ ہی ہے۔ اس کا یہ سوال وجواب بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

السوال

نماز جنازہ کے سلام کے بعد متصل ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنا شریعت میں کوئی اصل رکھتا ہے یا نہیں ؟

الجواب

"نمازِ جنازہ کے بعد متصل ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کا شریعت

میں کوئی ثبوت نہیں ہے اور نماز جنازہ خود ہی دعا ہے۔ ہاں لوگ اپنے اپنے دل میں بغیر ہاتھ اٹھائے دعائے مغفرت کرتے رہیں تو یہ جائز ہے۔ اجتماعی دعا ہاتھ اٹھا کر کرنا بدعت ہے۔"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہٗ

کفایۃ المفتی: ج ٤ : ص ٨٤

اس جواب میں پہلی بات جو بتانے کی ہے وہ یہ ہے کہ مطلقاً ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا تمام علماء کے پاس دعا کے آداب میں سے ہے۔ شاید حضرت مولانا کی یہ رائے پہلی رائے رہی ہو۔ یہ کہنے کی جرأت میں نے اس لیے کی ہے کہ حضرت مولانا خود لکھتے ہیں:

"اذان کے بعد جو الفاظ ادا کئے جاتے ہیں وہ دعا کے الفاظ ہیں اور رفع یدین آدابِ دعا میں سے ہے۔ اس لیے ہاتھ اٹھانے میں مضائقہ نہیں ہے۔"

(کفایۃ المفتی: ج ٣ : ص ٨)

یہ تو تھی بات دعا میں ہاتھ اٹھانے کی، اب رہ گئی نمازِ جنازہ کے کے بعد دعا کرنے کی بحث اس سے متعلق حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب نے شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے اور نمازِ جنازہ خود ہی دعا ہے کہنے کے باوجود لوگ اپنے اپنے دل میں بغیر ہاتھ اٹھائے دعائے مغفرت کرتے رہیں تو جائز ہے" فرمایا

ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نمازِ جنازہ کے بعد بھی دعا کی گنجائش ہے۔ پھر تُو تُو مَیں مَیں کرنے کی بات ہی کیا ہے۔!

مزید اطمینان حاصل کرنے کے لیے "شرحِ برزخ" کا یہ بیان بھی پڑھ لیں۔

امام عینی نے "شرح الھدایہ" الجزء الثانی فی المجلد الاول، باب الجنائز" کی ابتداء میں بیہقی سے لکھا ہے کہ جب صحابی براء بن معرور انتقال کیئے۔ سرور دوجہاںؐ تشریف لائے۔ وصلّی علیہ وقال اللّٰھم اغفرہ وارحمہ وادخلہ جنّتک رواہ البیہقی وقال الحاکم ھذا الحدیث صحیح نمازِ جنازہ پڑھے اوپر ان کے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور بعد نماز جنازہ کے یہ دعا کیئے: اے باری تعالیٰ بخش اس کو اور رحم کر اس کو اور داخل کر اس کو تیری جنّت میں۔ روایت کیا اس کو بیہقی نے اور حاکم نے یہ حدیث صحیح ہے اور جو قنیہ میں زاھدی سے منقول ہے اور اسی قول کو مرقاۃ وغیرہ کتب میں لائے ہیں۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

"نہیں جائز ہے دعا بعد نماز جنازہ کے کیوں کہ نماز جنازہ دعا ہے اور دعا کے بعد دعا زائد ہے"۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زاہدی اور صاحبِ قنیہ یہ دونوں معتزلی ہیں۔ معتزلہ کے پاس ثواب رسانی ہوتی کو جائز نہیں ہے۔ ان کے مسائل اگر مخالف اہلِ سنت جماعت ہوں تو اس کا اعتبار نہیں۔ صاف دلائل بالا سے ظاہر ہے کہ فقہائے کرام اپنے کتب میں بعد نماز جنازہ کے دعا کرنے کو لکھے ہیں۔ اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے پھر دعا کرنے میں کیا شبہ ہے؟ جوابِ ثانی این کہ یہ جو مرقوم ہے کہ نمازِ

جنازہ دعا ہے، دعا کے بعد دعا کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تحریر خلاف داب فقہاء ہے۔ نماز جنازہ من وجہ نماز ہے اور من وجہ دعا موافق دلیل استحسان کے جیسا کہ ھدایہ اور شرح وقایہ وغیرہ میں ہے کیوں کہ اس کو وضو اور تکبیر تحریمہ ہے مانند اور نمازوں کے، اسی سبب سے اس کو نماز جنازہ کہتے ہیں نہ دعائے جنازہ پس مطلق اس کو دعا کہنا جائز نہیں ہے۔ پھر اس پہ تفریع دوسرے مسئلہ کی کرنا کیسے جائز ہوگا۔"

تفریح الاثق ترجمہ شرح البرزخ: ص ۱۱۱

برزخ کے مصنف شیخ ابو سعید سلمی ہیں۔

"شرح برزخ" کا ترجمہ شاہ محمد عبد الغفار صاحب قادری کا ہے۔

مذکور حوالہ میں امام عیسیٰ نے جنازہ کی نماز کے بعد دعا کرنے کے ثبوت میں جو حدیث پیش فرمائی ہے، اس کی حاکم نے تصدیق بھی کر دی کہ وہ صحیح ہے اور قنیہ میں زاھدی سے نماز جنازہ کے بعد دعا کا عدم جواز جو منقول ہے صاحب شرح برزخ نے اس کے دو جواب دے کر رد کر دیا ہے تو پھر ہمارے تذبذب کی کوئی سند ہی نہیں ملتی۔

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی بعد نمازِ جنازہ دعا جائز ہے یا نہیں کے سوال کے اپنے بسوط جواب میں لکھتے ہیں:

> "جب دعا کی نسبت صاف حکم ہے کہ اس میں کسل نہ کرو بکثرت مانگو، رات دن مانگو، ہر حال مانگو تو ایک بار کی دعا پہ اقتصار کیوں کر مطلوب شرع ہو سکتا ہے۔ لاجرم حضور

پر نور صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل نماز، بعد نماز دونوں وقت میت کے لیے دعا فرمانا اور مسلمانوں کو دعا کا حکم دینا ثابت

فتاوی رضویہ: ج ٤: ص ١٩

اب آپ فتاویٰ دارالعلوم دیوبند کا سوال وجواب بھی ملاحظہ فرمائیے:

(سوال ٣١٣٧)

بعد نمازِ جنازہ قبل دفن چند مصلیوں کا ایصال ثواب کے لیے سورۂ فاتحہ ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار آہستہ آواز سے پڑھنا اور امام جنازہ یا کسی نیک آدمی کا دونوں ہاتھ اٹھا کر مختصر دعا کرنا شرعاً درست ہے یا نہیں؟

الجواب

"اس میں کچھ حرج نہیں ہے۔ لیکن اس کو رسم کر لینا اور التزام کرنا مثل واجبات کے اس کو بدعت بنا دے گا کما صرح بہ الفقہاء فقط

فتاوی دارالعلوم: ج ٥: ص ٤٣٤

میں نے آگے عرض کر دیا ہے کہ قیود و شرائط کا لحاظ اہم ہے آپ دیکھ رہے ہیں کہ مذکور فتوے میں حضرت مفتی صاحب نے نماز جنازہ کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کو اٹھتے ہی فرما دیا تھا " اس میں کچھ حرج نہیں ہے" لیکن اس کو لازم سمجھنا اور رسم بنا لینا بدعت بنا دے گا۔ مطلب یہ کہ اگر یہ

بات نہ ہو تو بدعت بھی نہیں ہے۔

نماز جنازہ کے بعد فاتحہ وایصال ثواب سے متعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ بیان پڑھ لیجیے، ذہن صاف ہو جائے گا۔!

ملفوظ نمبر ۱۵۶

"فرمایا کہ ایک صاحب کا خط آیا ہے لکھا ہے .... اور یہ بھی لکھا ہے کہ بعض لوگ بعد نمازِ جنازہ کہا کرتے ہیں کہ قل ھو اللہ پڑھ کر میّت کو بخش دو۔ کیا یہ جائز ہے۔ میں نے لکھا کہ آپ کو شبہ کاہے سے پڑا ہے؟

افاضات الیومیہ: حصہ ہفتم: ص ۱۳۸

مطلب یہ ہوا کہ نماز جنازہ کے بعد ایصال ثواب کرنا، فاتحہ پڑھنا ایسی چیز نہیں ہے کہ جس میں شبہ کیا جا سکے۔

مذکورہ دلائل وبراہین کی موجودگی میں پھر بھی کوئی چوں وچرا کرتے رہیں اور فروعی مسائل میں جھگڑا کرا کے مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی سعی کرتے رہیں تو ہم انھیں خدا کے حوالے کرتے ہیں:

وما علینا الا البلاغ

فاتحۂ مروّجہ

بعض بھائی فاتحۂ مروّجہ کے معنے نہ سمجھنے کی وجہ سے سرے سے فاتحہ وایصال وثواب کو ہی بدعت کہتے آرہے ہیں۔ حالاں کہ ایصالِ ثواب و وفاتحہ کے سنّت ومستحب ہونے میں کسی بھی عالم کو اختلاف نہیں ہے جیسا کہ آپ اگلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ آئیے اب ہم معلوم کریں کہ فاتحۂ مروجہ کس کو کہتے ہیں۔ اسی کے لیے اب آپ کی خدمات میں علمائے کرام اور مفتایانِ عظام کے فتاوی پیش کیے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے اور نوٹ کرلیجیے کہ فاتحۂ مروجہ کس کو کہتے ہیں۔!

سوال :-

ماقولکم رحمکم اللہ فی الفاتحہ المروجہ۔
یعنی فاتحۂ مروجہ سے متعلق آپ کی رائے کیا ہے ؟

الجواب

"تخصیص الفاتحہ باحضار الطعام والشراب والتزامها وظن العوام انها لازمة لایصال الثواب الی الاموات مخترعة مبتدعة الخ ترجمہ : فاتحہ کے لیے کھانے پینے کی چیزوں کو

روبرو رکھنے کی تخصیص کرنا اور اس کو لازم سمجھنا اور عوام الناس کا یہ گمان کر لینا کہ ایصال ثواب کے لئے ایسا کرنا لازمی ہے اختراع و بدعت ہے۔"

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ج ۵-۶: ص ۲۷۴ عزیز الفتاویٰ

حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب نے فاتحہ مروّجہ کے جو معنی بتائے ہیں دوسرے فقہاء علماء نے بھی یہی بتائے ہیں۔ اگر فاتحہ مروجہ سورۃ فاتحہ، سورہ اخلاص اور درود شریف پڑھ کر ایصال ثواب کرنا ہی ہوتا تو دارالعلوم ہی کے فتوی سے بڑے بڑے فاضل دیوبند اور دوسرے مکتبۂ فکر کے جبال العلم بھی بدعتی ٹھہرتے۔ نہیں! یہ بھی دیکھیئے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب نے فاتحہ کو نہیں، فاتحہ مروّجہ کو بدعت کہا ہے۔ کہا بھی ہے تو اس شرط پر کہا ہے کہ کھانا سامنے رکھنے کی تخصیص کی جائے اور لوگ اس کو لازم سمجھتے ہوں۔ ورنہ بدعت نہیں ہے۔ اذا فات الشرط فات المشروط۔

یوں بھی اس قسم کے لزوم کے بارے میں ایک نکتہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں کہ فان ایہام اللزوم ینتفی بالترک احیانا۔ (فی ردالمختار فی تعیین السور) یعنی کبھی کبھی ترک کر دینے سے لزوم کا وہم ختم ہو جائے گا۔

اب بھی اگر یہ بات کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو انہیں اپنے اساتذہ اور علمائے حقانی کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ فاتحہ کو مفتی باقیات مدظلہٗ عبادت بدنی میں داخل نہ کہیں اور مولانا شہیدؒ "بہترین ثواب ہے" فرمائیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قبر پر فاتحہ پڑھنے کا

طریقہ بتائیں۔ اور خود قبروں پر فاتحہ پڑھتے رہیں اور حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی فاتحہ کو "موجب رفعت درجات کا ہے" فرمائیں۔ ان تمام وضاحتوں کے باوجود بھی اگر ہم فاتحہ کو بدعت ہونے کا لغرہ لگائیں اور جلیل القدر علماء کو مفتیانِ عظام کو نیز عام مسلمان بھائیوں کو بدعتی اور قبر پرست کے خود ساختہ اور من پسند ٹائیٹل سے نوازیں تو بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی۔ شاید ان سارے بزرگوں کی مبارک روحیں بھی اس دریدہ دہنی سے اپنی قبروں میں بے چین ہوگئی ہوں گی۔ مزید وضاحت کے لیے حضرت مولانا عبدالحی کا یہ فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیے۔!

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں فاتحہ جو مروجہ ہے مشائخ صوفیاء میں اور بعض کتب مثل "آداب الطالبین" وغیرہ میں مذکور ہے اور طریقہ اس کا یہ ہے کہ شیرنی یا طعام وغیرہ رکھ کے سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص وغیرہ پڑھ کے میت کو ثواب بخشتے ہیں اور اس کا نام عرف میں فاتحہ ہے۔ جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ ثواب بمذہب اہلِ سنّت میّت کو پہنچتا ہے یا نہیں۔؟ بینوا توجروا

> ھُوالمصوب: ثواب اموات کو بمذہب اہل سنّت پہنچتا ہے۔ اور پڑھنا فاتحہ اور اخلاص وغیرہ کا اور اس کا ثواب بخشنا مُردوں کو موجبِ رفعتِ درجات کا ہے لیکن جو طریقہ فاتحہ کا مروج ہے کہ شیرینی وغیرہ سامنے رکھ کے

کھڑے ہو کے فاتحہ دیتے ہیں۔ اس کی اصل شرع میں نہیں ہے۔" واللہ اعلم : حررہ محمد عبدالحی عفا اللہ القوی۔
فتاویٰ محمد عبدالحی لکھنوی: ج ۱: ص ۸۱

حضرت مولانا لکھنوی کے اس جواب سے ان بھائیوں کی غلطی کھل کر سامنے آگئی جو سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص پڑھ کر قبر پر ہو یا کسی بھی تقریب میں ایصال ثواب کرنے کو بدعت سمجھ بیٹھے ہیں۔ حالاں کہ مولانائے موصوف نے واضح الفاظ میں لکھ ڈالا ہے کہ "پڑھنا فاتحہ، اخلاص وغیرہ کا اور اس کا ثواب بخشنا مردوں کو موجبِ رفعتِ درجات کا ہے۔" معمولی ذہن رکھنے والا آدمی بھی خوب سمجھتا ہے کہ جو کام موجبِ رفعتِ درجات ہو، ہرگز بدعت نہیں ہو سکتا۔

حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرزندارجمندِ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ارشاد فرماتے ہیں:

"طعامیکہ آن نیازِ حضرت امامین نمایند و بر آن فاتحہ و قل درود خوانند تبرک می شود۔"

دیکھ لیجیے شاہ صاحب نے کھانے پر فاتحہ پڑھنا صاف صاف لکھا ہے، یہی نہیں اور بھی فرمایا ہے کہ کھانے پر قل، درود پڑھنے سے وہ تبرک ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے اس فتوی کے بعد ہمیں اس

بارے میں اطمینانِ قلب میسر ہونا ہی چاہیئے۔

اور یہ بھی پڑھ لیجیئے کہ کھانا سامنے رکھ کر دُعا کرنا کون سی حدیث سے ثابت ہے ؟ کے جواب میں حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب جو حضرت مولانا عبدالوہابؒ بانئ باقیات صالحات ویلور کے پیر بھائی اور استاد بھائی ہوتے ہیں، اپنی تالیف " انوار ساطعہ" میں جس کے متعلق ان کے پیرو مرشد حضرت مولانا شاہ امداد اللہ مہاجر مکی اپنے ایک خط میں ارشاد فرماتے ہیں کہ" انوار ساطعہ" کے مسائل و دلائل مجھ کو پسند آئے "

رقمطراز ہیں کہ :

" ازانجملہ حدیث غزوہ تبوک کی مشکوٰۃ میں بروایت مسلم مذکور ہے۔ جب لوگ گرسنہ ہوگئے، حضرت عمرؓ دعا کرانی چاہی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تب آپ نے دسترخوان بچھوایا اور فرمایا: لے آؤ جو کچھ کسی کے پاس کھانا بچا ہوا ہو۔ تب کسی نے مٹھی بھر جوار، کسی نے مٹھی بھر کھجور کسی نے ٹکڑا روٹی کا، جس کے پاس جو کچھ بچا ہوا تھا لاکر ڈالا۔ بہت ہی تھوڑا سا ذخیرہ جمع ہوا۔ پھر آپؐ نے اس پر دعا فرمائی اور فرمایا بھرلو اپنے اپنے برتن پھر جس قدر لشکر تھا سب نے اپنے تمام برتن جو اُن کے پاس تھے بھر لئے اور خوب کھایا۔ اور پھر بھی کھانا بچ رہا۔

شارحین لکھتے ہیں کہ اس وقت لشکر میں لاکھ آدمی موجود

تھے۔ پس حدیث صحیح سے معلوم ہوا کہ لاکھ آدمی اس بات پر شاہد تھے کہ کھانا سامنے رکھے ہونے پر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی جو آپ کو ضرورت تھی۔ صاحب فاتحہ وہ دعا کرتا ہے جس کی اس کو حاجت اس وقت ہے۔ پس دعا ہونے میں دونوں برابر ہیں۔ یعنی دعا کی معنی شرع میں ہیں السوال من اللہ الکریم، یہ دونوں جگہ ایک ہیں۔"

الوار ساطعہ: ص ۶۲

آپ پڑھ چکے ہیں کہ حدیث شریف وہ بھی مسلم شریف کی واضح الفاظ میں بتا رہی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے پر دعا فرمائی ہے تو پھر ہم اس بحث میں کیوں الجھیں اور عوام الناس کو کیوں الجھائیں؟ میں یہ نہیں کہتا کہ کھانا سامنے رکھ کر ہی فاتحہ پڑھنی چاہیے۔ بلکہ یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں ہے کہ عبادتِ مالی کا ثواب فاتحہ پڑھ کے دعا کرنے سے ہی پہنچے گا ورنہ نہیں۔! اس بات کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ فاتحہ پڑھنے والے بھی جب کسی مسجد یا مدرسہ کو روپے پیسے یا کسی فقیر کو روپیہ کپڑا دیتے ہیں تو فاتحہ پڑھ کر نہیں دیتے۔

مزید وضاحت و ثاقت کے لیے "الوار ساطعہ" کی یہ عبارت پڑھ لیجئے۔ لکھتے ہیں:

"مولوی اسمٰعیل صاحب .... صراط مستقیم میں لکھتے

ہیں نہ پندارند کہ نفع رسانیدن باموات با طعام و فاتحہ خوانی خوب نسبت چہ این معنی بہتر و افضل است۔ (یعنی یہ نہ سمجھیں کہ کھانا کھلانے اور فاتحہ پڑھنے کے ذریعہ اموات کو نفع پہنچانا اچھا نہیں ہے۔ اس لیئے کہ یہ چیز بہتر اور افضل ہے۔)" ا (الانوار ساطعہ: ص ۶۷

"صراطِ مستقیم" کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اسمٰعیل بھی کھانے کے ساتھ فاتحہ پڑھنے کو منع نہیں کرتے۔ فھوالمراد

اب آپ قطبِ دوراں حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن قدس سرہٗ مرادآبادی کا یہ ارشادِ گرامی بھی پڑھ لیں۔

ان کی سوانح "کمالاتِ رحمانی" میں موجود ہے۔ مرتب لکھتے ہیں:

"فاتحہ کے مسئلہ میں مولوی صاحب نے کہا کہ ایک شخص مٹھائی لایا۔ کہ بڑے پیر صاحب کا فاتحہ کر دیجیئے۔ حضرت قبلہ نے فرمایا: لاؤ ہم فاتحہ کر دیں۔ راقم الحروف سے بھی حضرت قبلہ حضرت شاہ فضل الرحمٰن رح نے فرمایا تھا مٹھائی پر فاتحہ کر کے بچوں کو کھلا دے تو بزرگوں کی روح خوش ہوتی ہے۔"

کمالاتِ رحمانی: ص ۵۹۔

شیرینی وغیرہ پر فاتحہ کے سلسلہ میں باقیات صالحات ویلور

کا فتویٰ بھی اثبات میں ہے۔ پڑھ لیجیے:

سوال

کچھ شیرینی پکا کر یا کوئی میٹھی چیز اپنے سامنے رکھ کر سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص اور درود شریف پڑھ کر ان کا ثواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روحِ مبارک کو بخش سکتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

"شرح فقہ الاکبر میں ہے کہ عبادتِ بدنیہ و مالیہ دونوں نوعیت سے ثواب پہنچانا جائز ہے۔ شیرینی جیبہ برو رکھ کر فاتحہ دلانا، جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا پڑھنا عبادتِ بدنیہ ہے اور شیرینی کی تقسیم عبادتِ مالیہ ہے اور دونوں کا اجتماع ایک مقام پر ہوا ہے۔ ان اشیاء کا روبرو رکھنا نہ فرض ہے نہ حرام ہے بلکہ جائز ہے، منع نہیں۔ کذا فی کتب الفقہ والعقائد: واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ: عبدالوہاب عفی عنہٗ

الجواب صحیح: محمد ابوبکر ناظر باقیات

غیر مطبوعہ دفتر فتاوی باقیات۔ 66-8-30

بعض حضرات یہ بھی کہتے سُنے گئے ہیں کہ:
میت کو ثواب صرف دل کی نیت سے پہنچ جاتا ہے۔ منہ سے دعا مانگنا لغو ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نماز کی نیت دل سے کرنا کافی ہے

تاہم فقہائے کرام نے تلفظ بالنیت یعنی زبان سے نیت کرنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ حالاں کہ قرون ثلاثہ میں اس کا ثبوت ہی نہیں ہے۔
حضرت مولانا الیاس بانی تبلیغی جماعت لکھتے ہیں:

"اور فرض نمازوں کے بعد اللہ تعالیٰ سے دعا کا بہت زیادہ اس کام کے فروغ کے لیئے اہتمام کیا جائے۔ دعا تمہاری تمام عباوتوں کا مغز ہے۔ اس کے فروغ کے لیئے یٰس شریف کا ختم وغیرہ کرا کے اہتمام سے دعا منگواتے رہو۔"
مکاتیب حضرت شاہ محمد الیاسؒ: ص ۱۳۹

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایصال ثواب اور فاتحہ میں اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے؟ بعض حضرات دعا میں الحکم المتکاثر پڑھتے ہیں اور بعض یٰس شریف اور بعض الحمد شریف، قل ھو اللہ وغیرہ اور ہر شخص اپنے اپنے مقصد کے حصول کے لیئے دعا کرتا ہے پھر یہ رسہ کشی کیوں؟ اور بزرگوں کے بتائے ہوئے طریقوں کا انکار کیوں؟

"فاتحہ کے بارے میں علمائے متبحرین کے آراء ایک نظر میں"

۱ "تھوڑی سی شیرینی پر بنام خواجگانِ چشت فاتحہ پڑھیں"

- حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی

۲ " عوام مومنین کے مقابر میں بھی کبھی کبھی جا کر اُن کو فاتحہ اور ثواب سے یاد کرو۔"

- حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب صدر المدرسین دار العلوم

۳ "حضور انبیاء کرام اولیائے عظام وغیرہ کے لیے فاتحہ شرعاً منع نہیں"۔

- حضرت مولانا شیخ آدمؒ مفتی باقیات صالحات، ویلور

۴ "ایصالِ ثواب کی نیت سے گیارھویں اور توشہ کرنا درست ہے"۔

- حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔

۵ "قبر پر الحمد شریف قل ھو اللہ شریف وغیرہ پڑھتا ہوں"۔

- مولانا اشرف علی تھانویؒ

۶ "ایصال ثواب سنّت ہے۔ قرآن مجید کی تلاوت کا ثواب پہنچانے کو فاتحہ کہتے ہیں"۔

- مولانا شاہ عبد الشکور فاروقیؒ

۷ "سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص کا ثواب سب ثوابوں سے بہتر ہے"

• مولانا اسمٰعیل شہیدؒ

۸ "پڑھنا فاتحہ اور اخلاص وغیرہ کا اور اس کا ثواب بخشنا مُردوں کو موجبِ رفعتِ درجات کا ہے"

• مولانا عبدالحیٔ لکھنوی

۹ "ہمارے بڑے بڑے اساتذۂ کرام فاتحہ خوانی کرتے کراتے تھے"

• مولانا ابوالسعود احمد صاحب. بانیٔ سبیل الرشاد۔ بنگلور

۱۰ "سورۂ فاتحہ اور قل، درود پڑھ کر ایصالِ ثواب مستحب ہے"

• مولانا عامر عثمانی، فاضلِ دیوبند، مدیرِ 'تجلی'

تلك عشرة كاملة

○

ختمِ قرآنِ پاک وغیرہ پر شیرینی تقسیم کرنا

ھمارے بعض بھائی فاتحہ وایصال ثواب پر، تراویح میں ختم قرآن پاک پر، کسی لڑکے کے قرآن مجید شروع کرنے یا ختم کرنے پر اور کسی کارِ خیر کے اتمام پر خوشی میں دعوت کرنے اور شیرینی تقسیم کرنے پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں؟

اور بعض حضرات تو اس کے بھی بدعتِ سیئہ ہونے کا نعرہ لگاتے ہیں۔ اور اس طرح آپس میں تو تو میں میں کا سبب بن جاتے ہیں۔

آئیے اس کا بھی جائزہ لے لیں۔ کہ اس پر علمائے کرام کے فتاوی اور بزرگانِ دین کے آراء کیا ہیں؟ سب سے پہلے مدرسہ باقیات صالحات ویلور کا فتویٰ دیکھ لیجئے۔

سوال

قبرستان جاتے وقت کوئی شیرینی ہمراہ لے جانا اور بعد زیارت قبور اس شیرینی کو قبرستان میں تقسیم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا

المستفتی: عبدالقادر

زرگر ویلور

الجواب

"زیارتِ قبور کو جاتے وقت شیرینی لے جاکر بعد زیارت و فاتحہ یعنی ایصال و ثواب ہوتی حاضرین کو تقسیم کرنے کے متعلق کتبِ فقہ میں کوئی حکم دیکھا نہ گیا۔ اگر زیارتِ قبر کے لیے شیرینی لے جانے اور تقسیم کرنے کو لازم نہ سمجھیں تو شرعًا ممنوع نہ ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ شیخ آدم عفی عنہٗ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
ضیاء الدین محمد کان اللہ لہٗ	عبد الرحیم عفی عنہٗ	محمد عبد الصمد علمی عفی عنہٗ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
ضیاء الدین امانی عفی عنہٗ	سید محمد سعید کان اللہ لہٗ	عبد الصمد عفی عنہٗ

الجواب صواب : محمد غوث غفرلہٗ والوالدیہ

مذکورہ فتویٰ پر جنوبی ہند کے مشاہیر علمائے کرام کی تصدیقی دستخط دستخطیں ثبت ہیں۔ حضرت مولانا ضیاء الدین بانیٔ باقیات صالحاتؒ کے فرزند ارجمند ہیں اور باقیاتِ صالحات کے ناظرِ ثانی بھی۔ ان بزرگوں کی دستخطوں سے مزیّن مذکور فتویٰ بتا رہا ہے کہ ایصال ثواب کے لیے شیرینی تقسیم کرنا اور وہ بھی قبرستان لے جاکر اگر اس کو لازم نہ سمجھا جائے تو نہ یہ بدعت سیئہ ہے اور نہ شرعًا ممنوع ہے۔ ان چیزوں کا لے جانا محتاجوں اور مسکینوں کو دینے کے لیے ہی ہوتا ہے اور موتی کے لیے صدقہ کرنے کی فضیلت احادیث سے ثابت

ہے۔ ہمارے خیال میں اس کا مطلب یہی تو ہوا کہ اگر اس پر عمل ہو رہا ہو تو اس کو سختی سے روک کر خواہ مخواہ آپس میں اختلافات کو ہوا نہ دیں۔

قبور شہداء یا اولیاء اللہ رحمۃ اللہ علیہم پر جا کر اور قبر شریف ہی پر مالیدہ یا شیرینی مع پھول وغیرہ نیاز کرنا کیسا ہے چاہیئے یا نہیں؟

الجواب

"قبورِ مسلمین کی زیارت سنّت ہے. مزارات اولیائے کرام و شہداء رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی حاضری کی سعادت اور انھیں ایصال ثواب اور مالیدہ و شیرینی خصوصیات عرفیہ ہیں اگر وجوب نہ جانے ہرج نہیں اور قبر پر لے جانے کی نہ ضرورت نہ اس میں معصیت ہاں اسے شرعًا لازم جانے یا بغیر اس کے فاتحہ قبول نہ سمجھے تو یہ اعتقاد فاسد ہے۔ اس اعتقاد سے احتراز لازم ہے قبور مسلمین وخصوصًا قبور اولیاء پر پھول پڑھانا حسن ہے۔ عالمگیری وغیرہ میں اس کی تصریح فرمائی مگر شیرینی وغیرہ جو اس قسم کی چیزیں لے جائے اس کو قبر پر نہ رکھے یہ ممنوع ہے۔

فتاوٰی رضویہ: جلد چہارم: ص ۱۴۱

اب آپ راس المحدثین، استادِ کُل حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتوٰی بھی پڑھ ڈالیں جو "انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ" میں مسطور ہے۔

فرماتے ہیں:

"پس دہ مرتبہ درود خوانند وختم تمام کنند وبرقدرے شیرینی فاتحہ بنام خواجگانِ چشت عموماً بخوانند وحاجت از خدائے تعالیٰ سوال نمایند۔"

ترجمہ: پس دس مرتبہ درود شریف پڑھیں اور ختم (خواجگان) پورا کریں اور عموماً تھوڑی سی شیرینی پر بنام خواجگانِ چشت فاتحہ پڑھیں اور اپنی حاجت خدا سے طلب کریں۔

چلیے حضرت شاہ صاحب کے فتویٰ سے شیرینی پر فاتحہ پڑھنا جائز ہونے کی بات بھی کھل کر سامنے آ گئی۔ ظاہر ہے کہ جب شیرینی پر فاتحہ ہو گیا تو شیرینی کھائی بھی جائے گی اور تقسیم بھی کی جائے گی۔

تراویح میں ختم قرآن پاک پر شیرینی تقسیم کرنے سے متعلق فتاویٰ رشیدیہ کا یہ سوال وجواب بھی پڑھ ڈالئے جو درحقیقت دار العلوم دیو بند ہی کا فتویٰ ہے۔

مسئلہ:

چندہ فراہم کرکے بروز ختم قرآن شریف جو نماز تراویح میں پڑھا جاتا ہے شیرینی خرید کر تقسیم کرنا کیسا ہے؟

الجواب

"چندہ کرکے اس طرح شیرینی تقسیم کرنا درست ہے۔ علی الخصوص اس جگہ کہ اس شیرینی کا التزام کرلیوس اور اس کے تارک کو ملامت کریں نادرست ہے۔" فتاویٰ رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۴۱

مذکور فتوی میں التزام کر لینے کی بات آئی ہے تو حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، بانیٔ دار العلوم دیوبند کا یہ علمی لطیفہ بھی پڑھیئے اور اپنے معلومات میں اضافہ فرمالیجئے جس کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی زبانی "ارواحِ ثلاثہ" میں نقل کیا گیا ہے۔

حکایت ۲۷۲

"فرمایا کہ ایک مرتبہ مولانا محمد قاسم صاحب کے پاس آپ کے خادم مولوی فاضل حاضر تھے۔ مولانا نے اُن کو مٹھائی تقسیم کرنے کے واسطے فرمایا۔ کیوں کہ مولانا کا کوئی جلسہ مٹھائی سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اگر کہیں سے آئی ہوئی موجود نہ ہوتی تو خود منگوا کر تقسیم فرماتے، انہوں نے تقسیم کر دی۔ آخر میں اتفاق سے اس میں سے تھوڑی سی مٹھائی بچ گئی تو آپ نے فرمایا: الفاضل للقاسم یعنی بچی ہوئی مٹھائی قاسم کی ہے یا بچی ہوئی تقسیم کنندہ کی (؟) انہوں نے جواب دیا الفاضل للفاضل والقاسم محروم۔ یعنی فاضل مٹھائی تو مسمیٰ فاضل کی ہے اور قاسم محروم ہیں یا یہ کہ بچی ہوئی صاحبِ فضیلت یعنی آپ کی ہے تقسیم کنندہ محروم ہے۔) اہل علم کے لطیفے بھی علمی ہوتے ہیں۔"

ارواحِ ثلاثہ: ص ۲۶۷

مذکورہ عبارت سے بات واضح طور پر معلوم ہوگئی کہ بانیٔ دار العلوم دیوبند حضرت مولانا قاسم نانوتوی صاحبؒ کا کوئی بھی جلسہ مٹھائی کے تقسیم

سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اس جملہ کو خاص طور پر نظر میں رکھئیے گا۔ ”اگر کہیں سے آئی ہوئی موجود نہ ہوتی تو خود منگوا کر تقسیم فرماتے“) تو آپ کی بہت ساری الجھنیں دور ہو جائیں گی۔

حضرت مولانا عبد العزیز دہلویؒ کے نواسے حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق کی تصنیف ”مسائل اربعین“ کا یہ سوال و جواب بھی پڑھتے چلیے جو کان چھدائی اور ختنہ وغیرہ پر شیرینی کی تقسیم پر مشتمل ہے۔

مسئلہ:

در ختنۂ طفلان و در گوشوارۂ دختران تقسیم شیرینی و طعام می کنند جائز است یا نہ؟

جواب

”در شادی ختان طفلان دعوت نمودن و تقسیم طعام جائز بلکہ مستحب است۔ چناں چہ شیخ عبد الحق در شرح عربی مشکوٰۃ شریف نوشتہ ہمچنیں اگر تقسیم شیرینی کنند نیز جائز و مباح خواہد شد“

ترجمۂ مسئلہ: لوگ بچوں کی ختنہ اور لڑکیوں کے کان چھدائی کے موقع پر مٹھائی اور کھانے کی تقسیم کرتے ہیں یہ جائز ہے یا نہیں؟

”بچوں کے ختنہ کی خوشی میں دعوت کرنا اور کھانا تقسیم کرنا جائز بلکہ مستحب ہے۔ چناں چہ شیخ عبد الحق نے مشکوٰۃ شریف

کی شرح میں لکھا ہے کہ ایسا ہی اگر مٹھائی تقسیم کرے تو بھی مباح اور جائز ہوگا۔"

مسائلِ اربعین: ص ۱۰

اسی مسائل اربعین میں حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق رحمۃ اللہ علیہ صاحب نے بچوں کے مکتب کرتے وقت تقسیم شیرینی اور کھانا کھلانے کے بارے میں سوال پر رقمطراز ہیں کہ

مسئلۂ سابعہ

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ بعد آموختن سورۂ بقر شتر را نحر فرمودہ دوستانِ خود را خوارنیدہ بود۔ چناں چہ در تفسیرِ فتح العزیز مذکور است پس ازین روایت معلوم کردید کہ فرحت نمودن بعد حصولِ نعمت خصوصاً نعمتِ دینی خوارنیدن طعام و تقسیم شیرینی وغیرہ بدوستان جائز است۔"

مسائلِ اربعین: ص ۹

ترجمہ: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سورۂ بقر سیکھنے کے بعد اونٹ ذبح کر کے دوستوں کو کھلایا تھا۔ جیسا کہ تفسیر فتح العزیز میں مذکور ہے۔ پس اس سے معلوم ہوا کہ حصولِ نعمت کے بعد خوشی منانا خصوصاً نعمتِ دینی کے حصول پر کھانا کھلانا، تقسیم شیرینی وغیرہ کرنا جائز ہے۔"

مسائلِ اربعین کے اس جواب پر خصوصاً لفظ 'جائز' ہے۔ یہ

حضرت مولانا شاہ احمد سعید مجددی لکھتے ہیں کہ اس جواب میں لفظ جائز کا اطلاق ناسخ کا سہو ہو سکتا ہے۔ کہنا چاہیئے کہ "سنت ہے"۔ اس لیئے کہ اس کا ثبوت خلفائے راشدین میں سے خلیفۂ ثانی کے عمل سے مبرھن ہے اور خلفائے راشدین کے افعال کا سنّت ہونا حدیثِ شریف علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین الھادیین سے ظاہر ہے۔

تحقیق الحق المبین: ص ۵

شاہ صاحب کے اس فتوے سے بات صاف ہوگئی کہ کسی بھی نعمت کے حصول کے بعد خصوصًا دینی نعمت کے حاصل ہونے پر خوشی منانا کھانا کھلانا، شیرینی تقسیم کرنا مباح و مستحب ہی نہیں بلکہ سنّت ہے۔ اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہمارے بعض بھائی بلا سوچے سمجھے تقسیم شیرینی اور کھانا کھلانے کو کیوں مطلقًا بدعتِ سیّئہ کہہ دیتے ہیں اور سو وہ بھی بلا دلیل و بلا ثبوت۔ اللہ تعالےٰ ہم سب کو نیک توفیق عطا فرمائے اور علمائے محققین کے نقش قدم پر چلائے ۔ آمین !!

اب لگے ہاتھوں مولود شریف کے بعد مسجد میں شیرینی وغیرہ تقسیم کرنے کے متعلق حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتوی بھی پڑھ لیجئے :۔

سوال :

ہمارے ہاں رواج ہے کہ اکثر مساجد میں مولود شریف پڑھواتے ہیں اور کچھ شیرینی وغیرہ مسجد میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ جائز ہے یا ناجائز ؟

الجواب

"مسجد میں کوئی چیز تقسیم کردینی درست ہے بشرطیکہ مسجد کو ملوث کرنے والی چیز نہ ہو"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ: ج ۳: ص ۱۶۵

نیز حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کا فتویٰ پڑھ لیں۔ سوال وجواب درج ذیل ہے:

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علمائے دین کہ کسی کارِ خیر کے انجام کی خوشی میں دعوت کرنا یا شیرینی تقسیم کرنا مثلاً کسی کا لڑکا کلام مجید ختم یا شروع کرے یا محراب سنائے یا کوئی حج کرکے واپس آئے یا کسی قسم کی ترقی ہو تو خوشی میں بنظرِ شکریہ اپنے دوستوں، عزیزوں و حاضرین و مساکین کو کھانا کھلاوے یا کچھ تقسیم کرے جائز ہے یا نہ: بینوا توجروا

"ھُوالمصوب جائز ہے۔ اصل اس کی حدیث صحیح بخاری ہے جو "باب الطعام عند القدوم" میں مروی ہے۔ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لما قدم مدینۃ نحر جزورا او بقرۃ انتھی اور صحیح بخاری و مسلم وغیرہ میں قصہ قبول توبہ کعب بن مالک رضؓ میں مروی ہے: فلما جاءنی الذی سمعت صوتہ یبشرنی نزعت لہ ثوبی فکسوتھا ایاہ لبشارتہ

اور کبھی اس میں نہ ہے قلت یا رسول اللہ ان من توبتی ان انخلع
من مالی صدقة الی اللہ والی رسولہ قال امسک بعض
مالک قلت انی امسک سهمی الذی بخیبر انتہی
واللہ اعلم

کتبہ ابوالحسنات محمد عبدالحی

مجموعہ الفتاوی: ج ۲ : ص ۲۷۴

آپ نے حضرت مولانا لکھنوی کا جواب پڑھ لیا ہے جس میں حضرت لکھنوی نے سوال میں مذکور پانچ چیزوں سے متعلق جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے بخاری و مسلم شریف سے احادیث شریفہ نقل کرکے اس سلسلہ میں ہمیں کسی بھی تذبذب میں پڑنے سے بچالیا ہے۔ اب کوئی وجہ نہیں کہ ہم میں سے کسی کو کسی کارِ خیر میں دعوت کرنے شیرینی تقسیم کرنے پر بدعت کے بادل منڈلاتے نظر آجائیں۔

تاہم دل کے کسی گوشے میں پھر بھی شبہ باقی رہ گیا ہو تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا بیان ان کی اپنی زبانی پڑھ لیں۔ کہ انھیں ایک مرتبہ عید کے دن شیر پکانے پر بدعت کا شبہ ہوا تھا۔ "افاضات الیومیہ" کے مرتب لکھتے ہیں:

ملفوظ ۳۶۶

"ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا: کہ ایک بار مجھ کو بدعت کا شبہ ہوا۔ عید کے روز شیر پکانے کے متعلق۔ میں حضرت مولانا یعقوب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ایسے امور

ہیں زیادہ کاوش نہیں کرنا چاہیئے۔ لوگ بدنام کرتے ہیں اور عید
کے روز سیویاں پکانے کو کوئی عبادت اور دین نہیں سمجھتا جس
سے بدعت ہونے کا شبہ ہو۔ یہ جواب جو حضرت نے فرمایا، یہی
میری رائے ہے۔ اس میں تنگی نہیں کرنی چاہیئے۔ آج کل
اعتدال بہت کم ہے۔ افراط و تفریط بہت زیادہ ہے۔ اگر
خیال نہیں تو بڑی بڑی معصیتوں کا اور بدعتوں کا نہیں ہوتا اور
خیال ہوتا ہے تو مباح تک پر ہاتھ صاف کرتے کو اور اس کو
معصیت میں داخل کرنے کو تیار ہیں۔"

افاضات الیومیہ: حصۂ ششم: ص ۳۱۳

مذکورہ عبارت میں حضرت مولانا تھانویؒ کے آخری فقرے "آج کل اعتدال بہت کم ہے" سے آخر تک پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور اس کے بعد فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ سو فی صدی کھری اور سچی بات نہیں ہے؟ کیا آج کل ہمارے بعض بھائی اسی افراط و تفریط میں مبتلا ہو کر مسلمانوں میں فرقہ بندی اور ایک دوسرے سے دُوری اور نفرت کا سبب نہیں بن رہے ہیں۔ اللہ نیک توفیق عطا فرمائے اور ہمارے دلوں کو جوڑ دے۔

اب بیعت ہوتے وقت مٹھائی سے متعلق بھی پڑھ لیجئے:

سادات و مشائخ اور بزرگانِ دین کسی سے بیعت کرتے وقت یا کسی کو بیعت کراتے وقت ان کے معتقدین مٹھائی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں تو بعض لوگ اس پر بھی لے دے کرتے ہیں۔ اور بزرگوں کو متہم کرتے ہیں، یہ

ان بزرگوں کے حق میں زیادتی اور بدظنی ہے۔ ثبوت چاہیئے تو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کے والدِ محترم کا حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رح سے بیعت ہونے کا واقعہ پڑھ لیجئے کہ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی رح کسی کو بیعت کرا رہے تھے اس اثنا میں فرمایا : عبدالحق آؤ تم بھی بیعت ہو جاؤ۔ تو حضرت مولانا اشرف علی رح تھانوی کے والدِ محترم نے فرمایا: (اس کے بعد "حسن العزیز" کی یہ عبارت پڑھ لیجئے) مرتب لکھتے ہیں :

> "عرض کیا : حضرت مٹھائی منگوالوں۔ بس ایک سینی میں مٹھائی منگائی اور ایک سفید عمامہ رکھا ہوا منگایا اور پچیس روپے نقد یہ سب چیزیں حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں پیش کیں اور بیعت ہو گئے"
>
> حسن العزیز جلد دوم : ص ۸۸

اس موضوع پر اب حضرت مولانا مفتی محمود الحسن اور مولانا عبدالعزیز دہلوی رح کا فتویٰ پڑھ لیجیے اور اسی پر بس کر لیجئے۔ مزید دلائل کی بندہ ضرورت بھی نہیں سمجھتا۔

سوال

نیا مکان بنوا کر اس میں وعظ کہلوانا اور شیرینی تقسیم کرنا کیسا ہے ؟

الجواب

"حامداً و مصلیاً اگر برکت کے لئے شکریہ کے طور پر بغیر کسی ثابت التزام کے ایسا کرے تو درست ہے۔
فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم
محمود غفرلہٗ — فتاویٰ محمودیہ: ج ۵: ص ۱۵۶

سوال: (ملخص)

مالیدہ یا شیر برنج بہ نیت نیاز کدام بزرگ ہر دو صلحا را بخورانند این ہر دو را چہ حکم است؟

جواب

"اگر مالیدہ شیر برنج بنا بر فاتحہ بزرگے بقصد ایصال ثواب بروحِ ایشان نخبتہٗ بجورانیدہ مضائقہ ست جائز است:
ترجمہ: اگر ملیدہ اور فیرنی کسی بزرگ کی فاتحہ کے لئے ان کی روح کو ثواب پہنچانے کے ارادے سے پکا کر کھلائیں تو مضائقہ نہیں جائز ہے"
فتاویٰ عزیزی: ج ۱: ص ۴۱

آپ نے فاتحہ و ایصالِ ثواب پر، تراویح میں ختم قرآنِ پاک وغیرہ پر شیرینی تقسیم کرنے کے جواز میں جتنے نامی گرامی علمائے کرام نے فتوی دیا ہے

اُن کے اسمائے گرامی ایک نظر میں دیکھ لیں۔ اور فیصلہ کرلیں کہ ان بزرگوں کے خلاف چوں وچرا کرنے والا شخص کس قسم کا ہوگا۔؟

١ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ
٢ حضرت مولانا عبدالعزیز دہلویؒ
٣ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحبؒ دہلوی
٤ حضرت مولانا شیخ آدمؒ مفتی باقیات صالحات
٥ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحبؒ
٦ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ، بانیؒ دارالعلوم دیوبند
٧ حضرت مولانا شاہ احمد سعید مجددیؒ
٨ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
٩ حضرت مولانا ابوالحسنات مولوی عبدالحیؒ لکھنوی
١٠ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ دہلوی
١١ حضرت مولانا مفتی محمود حسینؒ

تلاوتِ قرآنِ پاک کے لیے اجتماع

ہمارے بعض بھائی اس مبارک اجتماع پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور بدعت کے نعروں پر نعرے لگاتے تھکتے نہیں ہیں حالاں کہ بڑے بڑے مستند علمائے کرام نے اس اجتماع کو جائز ٹھہرایا ہے۔ چناں چہ فتاوی رشیدیہ کا سوال وجواب پڑھ لیجیے :۔

سوال

سوم یعنی تیجا جو موتی کے واسطے کیا جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟ اگر تعین تاریخ اور تاکد موجب فساد ہے تو یہ اگر دور ہو جائے مثلاً پہلے روز یا دوسرے روز یا چوتھے روز یا پانچویں روز یا چھٹے روز ہو۔ شمار کے واسطے نخود نہ ہوں خرما ہو یا املی کے بیج ہو یا اور کوئی چیز ہو اور اس میں مال بھی یتیموں کا صرف نہ ہو تو بھی جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"اگر بلا تعین یوم کے جمع ہو کر ختم قرآن کریں یا کلمۂ طیبہ اور ایصال ثواب اس کا کریں تو جائز ہے۔ اکثر علماء کے نزدیک اگرچہ علامہ محمد محی الدین فیروز آبادی اجتماع میت کے ایصال ثواب کو بھی بدعت لکھتے ہیں 'سفر السعادت'

فقط فتاوی رشیدیہ: ص ۵۱

جیسا کہ اس موضوع کی سرخی ہی سے ظاہر ہے کہ ہم اجتماعی تلاوتِ قرآنِ پاک کے جواز پر مستند علمائے کرام کے فتاوی آپ کی خدمات میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتوے میں واضح الفاظ میں موجود ہے کہ "جمع ہو کر ختمِ قرآن کریں یا کلمہ طیبہ اور ایصال ثواب اس کا کریں تو جائز ہے اکثر علماء کے نزدیک۔"

جب اکثر علماء کے نزدیک جائز ہو تو کسی ایک کا اختلاف قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ نیز حدیث میں ہے کہ جب سعید بن معاذؓ کو دفنایا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سبحان اللہ سبحان اللہ پڑھا۔ ہم بھی دیر تک آپؐ کے ساتھ دیر تک وہی پڑھتے رہے۔ پھر آپؐ نے اللہ اکبر پڑھا ہم بھی دیر تک وہی پڑھتے رہے۔ پھر نبیٔ اکرمؐ سے پوچھا گیا کہ تسبیح و تکبیر پڑھنے کا کیا سبب ہے آپؐ نے فرمایا: سعیدؓ کو قبر نے دبالیا تھا۔ اس تسبیح و تکبیر کی برکت سے ان پر قبر ہر طرف سے وسیع ہو گئی۔ رواہ احمد: کذا فی المشکوٰۃ۔

حدیثِ مذکور سے قبر پر ذکر کرنا ثابت ہے۔ تلاوتِ قرآن پاک سے بڑا ذکر اور کیا ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قبر پر تلاوتِ قرآن پاک انفراداً ہو یا اجتماعاً جائز ہے۔ مذکور حدیث سے ثابت ہے کہ حضورؐ اور صحابہؓ نے اجتماعاً اجتماعاً ہی ذکر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے قرآنِ پاک کی تلاوت خواہ قبر پر ہو یا کسی بھی پاک مقام میں انفراداً ہو یا اجتماعاً جائز ٹھہرایا ہے

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھتے ہیں کہ

مسئلہ

"چند لوگوں کا مقرر کر دینا کہ وہ قبر پر بیٹھ کر قرآنِ مجید پڑھا کریں اور اس کا ثواب میّت کو دیا کریں جائز ہے۔ بشرطیکہ قبر پر بیٹھنا صرف اس غرض سے ہو کہ قرآنِ مجید پڑھنا التزام اور اطمینان کے ساتھ ہو جایا کرے۔"

درمختار ردالمحتار: علم الفقہ: ج ۲: ص ۲۱۳

حضرت مولانا کا فتویٰ خاص طور پر بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنے سے متعلق نیز اجتماعی طور پر تلاوتِ قرآن مجید کرنے سے متعلق کھلی سند ہے۔ جواز کی خواہ کوئی مانے یا نہ مانے۔

السوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرعِ متین مسائل ذیل بیں جو حدیثوں میں وارد ہے۔ میت کے واسطے اکہتر ہزار مرتبہ کلمۂ طیبہ پڑھا جائے وہ جنتی ہے۔ پس اگر دوسرے روز پڑھتے ہیں تو دوجا اور تیسرے روز پڑھتے ہیں تو تیجا علی ھذا چوتھا وغیرہ اور اسی کو علماء بدعت کہتے ہیں ثواب کس طرح سے میت کو ثواب پہنچایا جاوے اور میت کے مکان پر یا میت کی قریب کی مسجد میں بیٹھ کر قرآنِ مجید یا کلمۂ طیبہ کسی دن مقررہ پر پڑھنا یا نہیں؟

"جس وقت میّت پر جمع ہوتے ہیں، اس کی تجہیز وتکفین کے واسطے وہاں جو لوگ کاروبار میں مشغول ہیں وہ اپنے کام میں

رہیں اور باقی کلمہ پڑھیں۔ جس قدر ہو جاوے اور باقی کو اپنے گھر
پڑھ دیویں۔ کوئی حاجت اجتماع کی بھی نہیں۔ حدیث میں ایک
جلسہ میں پڑھنا جمع ہوکر پڑھنا تو ذکر نہیں ہوا۔ پڑھنا فرمایا
ہے۔ جس طرح ہو کر دیویں۔" فقط

(فتاویٰ رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۰۵)

مذکورہ جواب میں مولانائے محترم کا یہ جملہ "جس طرح ہو کر دیویں"
صاف دلالت کرتا ہے کہ قرآنِ پاک ہو یا کلمۂ طیبہ اجتماعاً ہو انفراداً ہر دو طرح
پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تو پھر ہم جیسے چھوٹوں کا اس بات میں الجھتے
رہنا کہ اجتماعاً جائز ہے یا نہیں! وقت ضائع کرنے اور ہیچوں میں دیگرے نیست
کا نعرہ لگانے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب
کا یہ فتویٰ بھی پڑھتے چلیئے اور دیکھیے کہ انھوں نے اجتماعی تلاوتِ قرآن پاک کے
متعلق کیا لکھا ہے:

الجواب

"قرآن خوانی کے لیے بستی کے مسلمانوں کو بلا تخصیصِ
یوم کے احیاناً جمع کر لینا مباح ہے۔ بشرطیکہ ان کو اجرت نہ
دی جائے۔ بلکہ پڑھنے والے لوجہ اللہ پڑھ کر ایصالِ ثواب کریں۔"

کفایۃ المفتی: ج ۴: ص ۱۱۷

یہ حقیقت ہے کہ اجتماعی تلاوتِ قرآن پاک کو بعض علماء نے مکروہ

کہا بھی ہے تو بس جہراً ہو تو مکروہ کہا ہے۔ اگر جہراً نہ ہو تو ان بعض کے پاس بھی مکروہ نہیں ہے۔ اور پھر بعض علماء نے جہراً تلاوتِ قرآن پاک کو مکروہ جو کہا ہے اس حیثیت بھی آپ کو حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی مندرجہ ذیل وضاحت سے اچھی طرح معلوم ہو جائے گی۔

"مولوی مرزا علی نظر بیگ مراد آبادی نے پوچھا کہ یہ جائز ہے یا نہیں؟ کہ چند آدمی ایک جگہ بیٹھ کر زور زور سے قرآن شریف کی تلاوت کریں۔ فرمایا اصل مذہب فقہاء کا عدم جواز ہے۔ بدلیل واذا قری القرآن فاستمعوا وانصتوا اور جب قرآن پڑھا جاوے تو غور سے سُنو اور خاموش رہو۔ لیکن مجھے اس استدلال میں کلام ہے۔ کیوں کہ قرآن کا پڑھنا دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تبلیغ کے لیے اور ایک بطورِ تلاوت کے آیت کا سیاق وسباق بتاتا ہے کہ یہ امر اس صورت میں ہے جب کہ تبلیغ کے لئے پڑھا جائے۔ کیوں کہ اوپر سے مخاطب کفار ہیں: واذا لم تاتیهم بآیۃ قالوا لولا اجتبیتها اور کفار حضورؐ کی تبلیغ وتعلیم سننے کو جمع ہوتے تھے۔ تلاوت سننے کے لئے جمع نہیں ہوتے تھے تو آیت کا ماحصل یہ ہوا جب دین کی تعلیم کی جاوے تو سُنو اور غل شور نہ مچاؤ۔ چاہے اس میں قرآن کی آیت بھی پڑھی جاوے۔"

مجالس الحکمہ: ص ۹۲

اس ارشادِ گرامی سے بات کھل کر سامنے آگئی کہ قرآن پاک پڑھنے والے کے لیے یہ حکم نہیں ہے پڑھنے والا خاموش کیسے ہو جائے گا؟ اور قرآن پڑھنے والے کو پڑھنے سے کیوں روکا جائے گا؟

نیز اس میں شک نہیں کہ نماز کے اندر امام کی قرأت کا سُننا اور اس وقت چُپ رہنا بالاتفاق فرض ہے۔ لیکن خارج میں اختلاف ہے بعض فرض کہتے ہیں، بعض مستحب۔ جو مستحب کہتے ہیں اُن کے پاس جہرًا پڑھنا مضائقہ نہیں۔

نیز عینی شرح ھدایہ میں لکھا ہے:

"ومما یدل علی ھذا ان المسلمین یجتمعون فی کل عصر ویقرؤن القرآن ویھدون ثوابہ لموتاھم وعلی ھذا اھل الصلاح والدیانۃ من کل مذھب وینکر ذالك منکر فکان اجماعًا خلافا للمعتزلہ

(عینی شرح الھدایہ: ج ۱: باب الحج عن الغیر)

یعنی جو بات اس پر (ایصالِ ثواب) دلالت کرتی ہے یہ بھی ہے کہ ہر زمانے میں مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر تلاوتِ قرآنِ مجید کر کے اس کا ثواب ہدیتہً اپنے موتی کو بھیجتے رہتے ہیں۔ ہر مسلک کے نیک اور دین دار لوگ اسی پر کاربند ہیں پھر کسی بھی شخص نے اس کا انکار نہیں کیا ہے۔ لہذا اس پر اجماع ہو گیا۔ صرف معتزلہ (ایک بدمذہب فرقہ) اس کے منکر ہیں۔"

جب امام عینیؒ نے گواہی دی ہو کہ ہر زمانہ میں مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر تلاوتِ قرآنِ پاک کرتے تھے تو پھر اب اس میں شبہ کیوں کیا جائے اور مسلمانوں میں خوامخواہ کی افراتفری کیوں پیدا کی جائے؟ جب کہ اس پر اجماع ہو گیا ہو!

اب اخیر میں حضرت مولانا محمود الحسن صاحب کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیجیے:

لکھتے ہیں:

"ایک جگہ جمع ہو کر قرآن شریف پڑھنا ناجائز نہیں ہے بلکہ فقہاء رحمہم اللہ تعالیٰ گنجائش اور اجازت بھی تحریر فرماتے ہیں۔ وفی ادرو المسیغة علی الفینیہ بکرة للقوم ان یقروا القرآن جملہ لتضمنہا ترک الاستماع والانصات وقیل لاباس بہ

طحطاوی مراقی الفلاح: ص ۱۸۸

فتاوی محمودیہ: ج ۶: ص ۱۳۶

فاتحہ کا کھانا

اس کے ضمن میں مجھے انتہائی دلی رنج وغم کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ہمارے بعض خود فراموش اور خدا فراموش بھائی انتہائی دیدہ دلیری کے ساتھ بے لگام ہو کر انبیاء اور اولیاء اللہ کے ایصال ثواب اور فاتحہ کے کھانے کو ناجائز وحرام ہی نہیں بلکہ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ کہتے ہیں کہ یہ کھانا کھانے سے خنزیر کھانا بہتر ہے۔ آہ! کس درجہ سیاہ بختی ہے ان قابلِ رحم بھائیوں کی کہ یہ ہولی، دیوالی کی کھلیں اور پوریاں مزے لے لے کر کھائیں گے خواہ یہ اشیاء بتوں کے آگے رکھ کر ہی کیوں نہ اٹھائے گئے ہوں۔ نہ ان میں کراہت آئے گی نہ حرمت! اگر آئے گی تو کھانے پر انبیاء اور اولیاء کا نام لینے سے آئیگی اوخدا! ہم پر رحم فرما، ہمیں معاف فرما اور ہمیں نیک توفیق عطا فرما۔ آمین

اس سے میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندوؤں کے ہاتھ کی بنائی چیزیں ہولی، دیوالی کی کھیلیں اور پوریاں ناجائز ہیں! ناجائز کیسے کہا جا سکتا ہے جب کہ علمائے کرام نے ان کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہو۔ چناں چہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ پڑھ لیجیے:۔

مسئلہ ۲:

ہندو تہوار ہولی، دیوالی میں اپنے استاد یا حاکم یا نوکر کو کھیلیں

یا پوری یا اور کچھ کھانا بطور تحفہ بھیجتے ہیں، ان چیزوں کا لینا اور کھانا استاد وحاکم ونوکر مسلمان کو درست ہے یا نہیں ؟

الجواب

"درست ہے۔" فقط: فتاویٰ رشیدیہ ج ۲ ص ۱۲۱

اب کیا ہم اتنی سی بات بھی سمجھنے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہیں کہ جن بزرگوں نے ہندو تہوار ہولی یا دیوالی کی کھیلیں یا پوری کھانا درست فرمایا ہو انبیاء و اولیاء کے فاتحہ کے کھانے کو ناجائز کیوں کر ٹھہرائیں گے ؟

اور ایک بات مسلمان بھائیوں کے دماغوں میں غلط بٹھائی گئی ہے کہ فاتحہ کا کھانا صدقہ واجبہ ہے۔ جیسے نذر کا کھانا۔ لہذا اغنیاء کو اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ فتوی کی مشہور کتاب "بدائع وضائع" میں فاتحہ کی شیرینی کھانے وغیرہ کو تبرع یعنی بنظرِ ثواب اپنی خوشی سے کوئی کام کرنا کہا ہے۔ چناں چہ مولانا عبدالحی بنگلوری، فاتحہ کے کھانے سے متعلق لکھتے ہیں کہ :

اغنیاء و فقراء کے حق میں یقیں کیوں کہ ہے وہ نافلہ صدقات سے
بھیجیں یا بلوادیں وہ مکروہ نہیں کچھ نہیں ہے واجبہ پہنچائیے

دور کیوں جائیں "زبدۃ النصائح" کا یہ فتویٰ پڑھ لیجیے، حقیقت واضح ہو جائے گی۔

مسئلہ :

"وطعام نذر اللہ اغنیاء را خوردن حلال نیست واگر فاتحہ

بنام بزرگے دادہ شد پس اغنیا را ہم خوردن ازان جائز است"
زبدۃ النصائح : ص ۱۳۲

ترجمہ: نذر للہ والا کھانا مال داروں کو کھانا جائز و حلال نہیں ہے ۔ اگر کسی بزرگ کے نام پر فاتحہ دلائی گئی ہو تو مال داروں کو بھی فاتحہ کا کھانا کھانا جائز ہے ۔

نذر کا کھانا چوں کہ صدقۂ واجبہ ہے ۔ لہذا مال داروں کو اس کا کھانا جائز نہیں ہے ۔ اس کے برخلاف عام فاتحہ کا کھانا تبرع ہے ۔ صدقۂ واجبہ نہیں ہے ۔ لہذا مال داروں کا بھی اس کا کھانا بلا شک و شبہ جائز ہے ۔ ثواب ثواب کی کمی و بیشی کا مسئلہ الگ ہے ۔ چناں چہ دارا لعلوم دیوبند کا فتویٰ ہے :

السوال

صاحبِ زکوٰۃ کو ثواب کی نیّت سے کھلانا کیسا ہے ؟

الجواب

"فقراء کو کھلانے میں زیادہ ثواب ہے ۔ اگر اخلاصِ نیّت کے ساتھ ہو "

فتاویٰ دارالعلوم : ج ۵ : ص ۴۵۴

فاتحہ کا کھانا ثواب کی نیّت ہی سے کھلایا جاتا ہے تو دارالعلوم دیوبند کے فتوی سے بھی یہی بات سامنے آئی کہ فاتحہ کا کھانا مال داروں کو بھی کھلایا

جا سکتا ہے۔ مگر فقراء افضل ہیں افضل و مفضول ہونے کی بحث الگ ہے۔ نفسِ جواز میں کوئی کلام نہیں ہے۔ اس لیے کہ حدیث شریف میں ہے کل معروف صدقہ (الحدیث) ترجمہ: ہر نیکی صدقہ ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ مالداروں کو کھلانے میں بھی ثواب ملتا ہے۔ اس لیے کہ اغنیاء کو کھلانا بھی معروف ہے نیکی ہے۔ چلئے اب مولانا عبدالعزیز دھلوی کا فتویٰ بھی پڑھ لیں۔

"طعامیکہ ثواب آن نیاز حضرت امامین نما بندو برآں فاتحہ و قل و درود خواندن تبرک می شود خوردن بسیار خوب است۔"

ترجمہ: "وہ کھانا جس کا ثواب حضرت امام حسن اور حسین رض کی نیاز بنادیں اور اس پر فاتحہ، قل، درود پڑھنے سے وہ تبرک بن جاتا ہے۔ اس کا کھانا بہت اچھا ہے۔"

فتاوی عزیزی: ج ۱: ص ۷۵

لیجئے حضرت مولانا دہلویؒ نے تو معاملہ ہی صاف کر دیا۔ حضرت امام حسن اور حسین رض رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے فاتحہ کے کھانے کو کھانا جائز ہی نہیں فرمایا بلکہ کہہ دیا "تبرک میشود" یعنی کھانا بابرکت ہو جاتا ہے اور اس کا کھانا بہت اچھا ہے۔ سوچیئے اچھی طرح سوچیے کہ پھر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے کھانے کے کھانا کا کیا عالم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ انبیاء اور اولیاء کے فاتحہ کا کھانا بلاتفریق مال دار اور غریب کے لیے برکت ہی برکت کا باعث ہے۔

اب وہ بھائی غور فرمائیں جو کسی غلط فہمی کی وجہ سے فاتحہ کے کھانے کو ناجائز سمجھتے ہیں اور پھر حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کو ہندوستان کے سارے عالموں کے پیشوا بھی مانتے ہیں، بات کتنی غلط ہو جاتی ہے کہ انھیں سارے عالموں کا پیشوا بھی مانیں اور اُن کے اور اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا عبدالعزیز دھلوی کی کہی ہوئی بات اور اُن کے فتوے کو پسِ پشت ڈال دیں اور اپنی ہی ہٹ دھرمی چلائیں۔ کیا انھیں کل قیامت کے دن بلا دلیل حلال طیب کو حرام ٹھہرا کر مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر لڑانے سزا کے لیے تیار نہیں رہنا ہے؟ ہے ضرور ہے۔ یہ دشمنانِ اسلام کی گہری سازش ہے کہ وہ پہلے مسلمانوں میں معمولی معمولی مسائل میں پھوٹ ڈال کر لڑاتے ہیں جب مسلمان آپس میں لڑ کر اپنی طاقت کھو بیٹھتے ہیں تو آخر میں دشمنانِ اسلام ہم پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور ہمیں کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ اللہ محفوظ رکھے

اس موقع پر ہمیں بلا دلیل حلال کو حرام اور حرام کو حلال ٹھہرانے والے سے متعلق حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز دہلویؒ کا یہ فتویٰ پڑھ لینا چاہیے۔ فرماتے ہیں:

> "اگر وہ شخص جانتا ہے کہ فلاں چیز شریعت میں حرام ہے۔ پھر بھی محض نفس کی اتباع میں اس کو حلال کہتا ہے یا بالعکس یعنی فلاں چیز شریعت میں حلال ہے۔ اس کو نفس کی اتباع میں حرام کہتا ہے تو وہ شخص کافر ہو جائے گا اگر جانتا نہیں ہے تو کافر نہیں ہوگا۔" فتاوی عزیزیہ: ج ۱: ص ۱۵۶ (اخذ و ترجمہ)

بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ دوست واحباب فقراء وغیرہ کو کھانا کھلانا یا ان میں کھانا تقسیم کردینے کے بغیر موتی کو ثواب نہیں پہنچتا ایصال ثواب کی نیت اس سے قبل درست نہیں ہے۔ گویا ان کے پاس نیت المؤمن خیرٌ من عملہ (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) والی حدیث کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آئیے دیکھیں کہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کا مسلک کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

> "اگر شخصے بزے را خانہ پرورکند تا گوشت اوخوب شود اوراذبح کردہ وپختہ وفاتحہ حضرتِ غوث اعظم رضی اللہ عنہٗ خواندہ بخورانند خللے نیست"۔ (تقریر ذبیحہ)
>
> ترجمہ:۔ اگر کوئی شخص کوئی بکرا گھر پہ پالے تاکہ اس کا گوشت عمدہ ہو اور اسکو ذبح کرکے پکاکر اور حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہٗ کی فاتحہ پڑھ کر کھلائیں تو کوئی خلل نہیں ہے۔
>
> تقریرِ ذبیحہ

دیکھ لیجئے مولانائے محترم نے "فاتحہ خواندہ بخورانند" (فاتحہ پڑھ کر کھانا کھلائیں) فرمایا ہے۔ خورانندہ فاتحہ بخوانند (کھانا کھلانے کے بعد فاتحہ پڑھیں) نہیں فرمایا ہے۔ اس لیے کہ حدیثِ شریف میں ہے نیت المؤمن خیر من عملہ اب کسی کا یہ کہنا کہ کھانا کھلانے یا تقسیم کردینے کے بغیر فاتحہ پڑھنا غلط ہے تو غلطی کو مولانائے موصوف کی طرف منسوب کرنا ہے۔

یہ بھی سُن لیجیے کہ لوگوں میں مشہور ہے کہ طعام المیّت یمیت القلب (میّت کا کھانا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔) حدیث ہے۔ لہٰذا یہ حدیث ہے بھی یا نہیں جاننے کے لیئے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ پڑھ لیں:

السوال

طعام المیت یمیت القلب عام ہے۔ خواہ اولیائؒ انبیاء ہوں یا عامۃ المومنین لیکن طعام اموات عامہ سے جو کراہت و تکدرِ قلب میں محسوس ہوتا ہے وہ طعام اولیاء و انبیاء سے نہیں ہوتا۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ اگرچہ انبیاء اولیاء حقیقۃً مثلِ امواتِ عامہ کے نہیں ہیں۔ لیکن بظاہر اموات ہیں اور طعامِ امواتِ عامہ و اولیاء و انبیاء صدقہ ہونے میں برابر ہے

الجواب

"یہ قول خدا جانے کس کا ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو نہ مانے اس پر تو کوئی اشکال ہی نہیں۔ اور اگر کوئی شخص زکوٰۃ کے وسخ ہونے سے استنباط کرے کہ جب صدقۂ واجبہ میں وسخیت ہے تو صدقۂ نافلہ بوجہ اشتراک معنی صدقہ کے شاید کوئی کیفیت قربت وسخ کے ہو۔ اسی کا موتِ قلب سے تعبیر کیا گیا ہو۔ اس صورت میں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ فرق خیالی ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عرفِ عام میں اموات کے طعام کا کھانا تذلیل سمجھا جاتا ہے۔ وہ کدورت اسی تذلیل کی ہے جو ایک طبعی امر ہے۔ نہ کوئی امر ذوقی و باطنی اور بعض

کے لیے یہ وجہ ہے کہ عام اموات چوں کہ اکثر نزدیک کے مرے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے طعام سے ان کی موت کا اور ان کے معاصی کا استحضار ہوجاتا ہے۔ یہ سبب ہوتا ہے دلگیری اور انقباض کا بخلاف اولیاء و انبیاء کے کہ اکثر کی موت کا اس میں مشاہدہ بھی نہیں ہوا اور خیال میں ظاہراً وہ بھی مثل دیگر احیاء کے معلوم ہوتے ہیں اس لیے انقباض نہیں ہوتا۔ آگے کو معلوم ہے۔"

فتاویٰ امدادیہ: جلد سوم: کتاب مسائل شتی: ص ۱۳۶

ہم نے اپنے اساتیذ کرام سے سنا ہے کہ طعام المیت یمیت القلب کسی بزرگ کا قول ہے حدیث نہیں ہے۔ اگر یہ حدیث ہو جیسا کہ بعض لوگوں کا زعم ہے تو پھر اُن کے قول کے مطابق دسواں، بیسواں، چہلم ہی نہیں بلکہ غیر متعین صدقات بھی ناجائز ٹھہریں گے۔ اس لیے کہ اس میں مطلقاً طعامِ میّت کو منع کیا گیا ہے۔ اور اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ مگر معلوم نہیں کہ کس کا قول ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے فرمایا ہے: بعض بزرگوں نے اس قول کی تاویل کی ہے اور بتایا ہے کہ طعام المیت میں المیت سے مراد مردہ دل آدمی کا کھانا، کھانے والے کے دل کو مردہ کر دیتا ہے۔

زیارتِ قبور

مطلقاً مسلمانوں کی قبروں کی زیارت سنّت ہے ۔ اور اولیاء کی زیارت میں اور زیادہ انوار و برکات ہیں۔ زیارتِ قبور کا ثبوت مسلم شریف کی اس حدیث شریف سے ملتا ہے ۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا : ترجمہ : میں نے تمہیں زیارتِ قبور سے روکا تھا پس اب قبروں کی زیارت کرو ۔

زوروھا امر کا صیغہ ہے ۔حسبِ اقوال علمائے کرام قبروں کی زیارت کے سنّت ہونے پر دلالت کرتا ہے ۔چناں چہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح رقمطراز ہیں :۔

> "زیارتِ قبور اولیاء مطلقاً قبور مسلمین کی زیارت مستحب و مسنون ہے ۔ اولیاء اللہ کی زیارت میں اور زیادہ انوار و برکات ہیں ۔ صرف بعض لوگوں کو اس کے لیے سفر کرنے میں خلجان ہے ۔ مگر الفاظِ حدیث الا فزوروھا کا اطلاق حضر و سفر دونوں کو شامل ہے ۔ اور حدیث شد الرحال مساجد کے ساتھ خاص ہے ۔جب کہ تضعیف اجر کی نیّت سے سفر کیا جاوے ۔ کما

لا یخفی علی اهل العلم۔

حاشیہ "مکتوباتِ امدادیہ": ص ۱۰

کیا آپ نے حضرت مولانا کے اس فقرہ کو نوٹ کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں: "اولیاء اللہ کی زیارت میں اور زیادہ انوار و برکات ہیں۔" اب ان منہ پھٹ اور گستاخ لوگوں کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ جو اولیاء کرام ہی نہیں بلکہ انبیاء علیہم السلام کی شانِ اقدس میں بھی یہ کہہ کر کہ نعوذ باللہ "وہ مر کر مٹی میں مل گئے، اس مٹی کے ڈھیر میں رکھا ہی کیا ہے؟" اپنی عاقبت بگاڑ لیتے ہیں۔ کیا یہ علمائے دیوبند کے معتقد ہیں، کیا یہ علمائے باقیات صالحات کے متبعین ہیں؟ کیا یہ دائرۂ اہل سنّت والجماعت میں داخل ہیں۔ اگر نہیں تو پھر زیارت کے اس مسئلہ کو بھی آپ اہل السنتہ و غیر اہل السنہ میں فارق بنا لیجیے اور لوگوں کو اس ترازو میں تول لیجیے:۔

جب معلوم ہو گیا کہ زیارتِ قبور مسنون ہے اور اولیاء اللہ کی زیارت میں زیادہ انوار و برکات ہیں تو پھر طریقہ زیارتِ قبور کیا ہے۔ وہ بھی معلوم کر لیجیے۔

فتاوی عالمگیری میں لکھا ہے:

"جب کوئی شخص زیارتِ قبور کا ارادہ کرے تو مستحب ہے کہ اپنے گھر میں دو رکعت پڑھے۔ ہر رکعت میں سورۂ الحمد اور آیتہ الکرسی ایک بار اور سورۂ اخلاص تین بار پڑھے۔ پھر اس کا ثواب میّت کو پہنچا دے۔ تو اللہ تعالیٰ میّت کی قبر میں ایک

نور بھیجتا ہے اور مصلی کو ثواب کثیر عطا فرماتا ہے۔ پھر مقابر کی طرف روانہ ہو۔"

ترجمہ فتاویٰ عالمگیری: ج ۴ : ص ۳۱۷

حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی "علم الفقہ" میں لکھتے ہیں:

"قبروں کی زیارت کرنا یعنی ان کو جا کر دیکھنا مستحب ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہر ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ زیارتِ قبور کی جائے اور بہتر یہ ہے کہ وہ دن جمعہ کا ہو۔ بزرگوں کی قبروں کی زیارت کے لیے سفر کر کے جانا بھی جائز ہے۔ عورتوں کے لیے بھی زیارتِ قبور جائز ہے بشرطیکہ جوان نہ ہوں اور رنج و غم کے تازہ کرنے کے لیے زیارت نہ کریں بلکہ عبرت و برکت حاصل کرنے کی غرض سے۔"

ردالمحتار شرح منیہ وغیرہ: ج ۲ : ص ۲۱۴

حضرت مولانا نے بھی اپنے فتویٰ میں برکت حاصل کرنے کی غرض سے زیارت کرنے کی بات کی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح نے بھی زیارتِ قبور میں انوار و برکات کا ذکر فرمایا ہے۔ تاہم ہمارے بعض دین دار بھائی یہ سوچ کر کے بزرگوں کی مزارات پر عوام الناس بدعت اور خلافِ شرع حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں زیارتِ قبور ترک کر دیتے ہیں۔ کاش! کہ ہمارے یہ دیندار

بھائی نکاح اور دوسری ان مجلسوں کا بھی، جس میں کیمرے استعمال ہوتے ہیں، تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ویڈیو فلمیں چلتی ہیں، بے پردگی ہوتی ہے۔ اسی طرح بائیکاٹ کر دیتے اور دوسرے وہ سنٹر جہاں ٹیلی ویژن پر دھڑلے سے فلمیں دکھائی جاتی ہیں قدم نہ رکھتے تو بیسیوں برائیوں کا سدّ باب ہو جاتا مگر نہیں وہاں کی بات اور ہے اور یہاں کی بات اور، آخر کیوں؟

آپ شاید سوچتے ہوں گے کہ یہ شخص قبروں پر منکرات ہی کیوں نہ جاری ہوں زیارت کرنے کی ترغیب دے رہا ہے؟ احقر اتنی جرأت نہیں کر سکتا اگر حضرت علامہ ابنِ حجر کا فتویٰ "ردالمحتار" میں اور حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا فتویٰ "علم الفقہ" میں نہ ہوتا۔

لگے ہاتھوں یہ دونوں فتاوی آپ بھی پڑھ لیں پھر ان پر عمل کریں۔

"قال ابن حجر فی فتاویه ولا تترک لما یحصل عندها من منکرات ومفاسد کاختلاط الرجال بالنساء وغیر ذالک لان القربات لا تترک بمثل ذالک بل علی الانسان فعلها وانکار البدع وازالتها ان امکن قل ویؤیده ما مر من عدم ترک اتباع الجنازة وان کان معها نساء ونائحات تامل۔"

ردالمحتار: جلد اول: ص ۶۶۴

ترجمہ: ابنِ حجر نے اپنے فتاوی میں کہا ہے کہ قبروں کے پاس منکرات و مفاسد مثلاً مردوں اور عورتوں کے اختلاط وغیرہ

کے وقوع پذیر ہونے کی وجہ سے زیارتِ قبور ترک نہ کی جائے اس لیے کہ قربات اس قسم کی چیزوں کی وجہ سے ترک نہیں کئے جاتے بلکہ آدمی پر لازم ہے کہ وہ زیادہ بھی کرے اور بدعتوں کا انکار بھی بلکہ اگر ممکن ہو تو بدعتوں کا ازالہ کرے۔ انتہی میں کہوں گا کہ اوپر گزری ہوئی یہ بات کہ اگر جنازے کے ساتھ نوحہ کرنے والی عورتیں بھی کیوں نہ ہوں جنازہ کی مشایعت ترک نہیں کی جائے گی۔ اس کی تائید میں ہے"۔

اب حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کا فتویٰ بھی پڑھ لیں، لکھتے ہیں:

"زیارتِ قبور کا محض اس خیال سے ترک کر دینا کہ وہاں عوام لوگ بدعت و شرک کی باتیں مثل طوافِ قبور اور سجدۂ قبور وغیرہ کی کرتے ہیں۔ یا نامحرم عورتیں وغیرہ جو وہاں جمع ہوتی ہیں۔ نہ چاہیے بلکہ ایسی حالتوں میں انسان کو لازم ہے کہ ان امور کو حتی الامکان روکے اور زیارتِ قبور سے باز نہ رہے۔"

رد المحتار بحر الرائق: علم الفقہ: ص ۲۱۵

اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ڈاکٹروں کی ضرورت بیماروں کو ہوتی ہے۔ اور ڈاکٹر کا عملی میدان بیمارستان ہے۔ مصلحین کی ضرورت مفسدین میں ہوتی ہے۔ مصلحین کا عملی میدان وہ مقامات ہیں جہاں عقیدوں کا فساد اور بدعتوں کا

رائج ہو۔ اگر مزارات پر منکرات کا ارتکاب ہوتا ہو اور وہاں مصلحین اور نیک لوگوں کی آمد ورفت زیادہ ہو اور صبر وتحمل کے ساتھ افہام وتفہیم کا کام جاری رہے اور ان بھائیوں کے ساتھ مصلحین کو محبت و ہمدردی ہو نفرت نہ ہو تو مذکورہ برائیاں اِن شاء اللہ دور ہو جا سکتی ہیں۔

اب رہا اثنائے سفر میں اولیاء اللہ کی مزارات کی زیارت کرنے یا اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے خاص طور پر سفر کر کے جانے کا مسئلہ! اس سلسلہ میں حضرت مولانا یعقوب صاحب مدرس دار العلوم دیوبند کا بیان پڑھ لیجیے جو انھوں نے اپنے پہلے سفرِ حج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "بالجملہ سکھر سے چل کر آٹھویں دن شہر سوان میں پہنچے، یہاں مزارِ حضرت لعل شہباز قلندر کی مشہور زیارت گاہ ہے اور سائلوں کا بہت ہجوم ہے یہ بستی بھی بہت اچھی ہے۔ خام اور چوبی تعمیر اکثر ہے۔ میں نے بھی اس شہر کو دیکھا اور زیارت حضرت لعل شہباز کی کی۔ بہت شان و شوکت کی زیارت گاہ ہے۔ یہاں بہت حاجت مند آتے ہیں اور پڑے رہتے ہیں اور مانگ کر کھاتے ہیں۔ اور اپنے عقیدے کے رو سے یہاں سے مرادیں پاتے ہیں۔"
>
> بیاضِ یعقوبی: حصۂ اوّل: ص ۱۷۲

مولانا موصوف نے اسی طرح اثنائے سفر میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ

شیخ ابوالحسن شاذلیؒ اور حضرت مخدوم بابا فرید گنج شکرؒ وغیرہ کے مزارات پر پہنچ کر زیارت کرنے کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس کا جی چاہے مکتوبات اور بیاض یعقوبی دیکھ لیں۔

اب ہمارے ان بھائیوں پر بے حد تعجب ہوتا ہے جو اثنائے سفر ہیں خواہ سفر تعلیمی ہو یا اور کوئی۔ اپنا شریکِ سفر کسی بزرگ کی مزار پر زیارت کے لیے جانے کا قصد کرے تو بڑے ہی عالمانہ شان سے انھیں ڈانٹ پلاتے ہیں کہ ارے تم علم حاصل کرنے کے لیئے نکلے ہو یا زیارتیں کرنے کے لیے۔ چلو آگے بڑھو۔ ان بدعات ہیں کیا رکھا ہے۔ نعوذ باللہ! ان علّامہ صاحب کے پاس اب سنّتیں بھی بدعتیں ہو گئیں۔ یہ کوئی افسانہ نہیں، اپنے کانوں سُنی ہوئی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک توفیق عطا فرمائے۔

زیارت کے لیے سفر سے متعلق باقیات صالحات ویلور اور دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی پڑھ لیجیے:

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ کسی ولی کی مزار شریف کی زیارت کو کسی دوسری بستی کو سفر کر کے جانا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

"زیارتِ قبور سنّت مستحبہ ہے۔ دُور ہو یا نزدیک بشرطیکہ اس کے ادا کرنے میں ارتکاب ممنوعاتِ شرعیہ نہ ہووے مثل حرام اور ترک فرض اور شرک وغیرہ۔ فقط

کذا فی کتب الفقہ وشرح الحدیث واللہ اعلم:

شرح دستخط : کتبہ عبدالوہاب کان اللہ تعالیٰ لہٗ
غیر مطبوعہ دفتر فتاویٰ بانی باقیات : ص ۱۵۰

سوال

کسی بزرگ یا ولی یا پیر کی مزار پر قصد کر کے اور سفر کر کے جانا کیسا ہے ؟

الجواب

" بغیر کسی خاص دن کے تعیین کے اگر کبھی چلا جائے تو کچھ مضائقہ نہیں اور اولیاء اللہ کی مزارات پر جانا برکت سے خالی نہیں ہے "

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند : ص ۴۵۸

آپ نے زیارت کے لیے سفر سے متعلق جنوبی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ کا فتویٰ بھی پڑھ لیا اور شمالی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ کا فتوے بھی دونوں درس گاہوں کے دارالافتاء نے اولیاء اللہ کی زیارت کے لیے سفر کو جائز بتایا اور بابرکت بھی ۔ دونوں مدرسے اہل السنۃ والجماعۃ کے ہیں ۔ نیز یہ بھی ثابت ہی ہے کہ :

۱۔ حضور ؐ جنت البقیع اور شہدائے احد کی زیارت کو تشریف لے جایا کرتے تھے ۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر حضور ؐ اور

ابو بکرؓ، عمرؓ پر سلام بھیجتے تھے۔

۳۔ حضرت بلالؓ نے ملکِ شام سے حضورؐ کی قبر مبارک کی زیارت کے لیے مدینۂ منورہ کا سفر کیا تھا۔

۴۔ عمر بن عبدالعزیزؒ شام سے مدینۂ منورہ کو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر سلام پہنچانے کے لیے قاصد روانہ کرتے تھے

زیارتِ قبور پر پیش کرنے کے لیے مزید بیسیوں دلائل ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ اب مزید دلائل کی ضرورت ہے۔

اب آپ نجدیوں اور وہابیوں کا فتویٰ اولیاء اللہ کی مزارات کے لیے ہی سفر نہیں بلکہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کے لیے سفر سے متعلق بھی جگر تھام کر وہ بیان پڑھیے جو شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نے نجدیوں اور وہابیوں کے عقیدے سے بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

لکھتے ہیں:

> "(۳) زیارتِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم و حضوریٔ آستانۂ شریفہ و ملاحظۂ روضۂ مطہرہ کو یہ طائفہ (وہابی و نجدی) بدعت حرام وغیرہ لکھتا ہے۔ اس طرف اس نیت سے سفر کرنا محظور و ممنوع جانتا ہے: لاتشد الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد ان کا مستدل ہے۔ بعض ان میں کے سفر و زیارت کو معاذ اللہ تعالیٰ زنا کے درجہ کو پہنچاتے ہیں۔ اگر مسجدِ نبوی میں جاتے ہیں صلاۃ و سلام ذاتِ اقدسِ نبویؐ علیہ الصلوٰۃ والسلام

کو نہیں پڑھتے نہ اس طرف متوجہ ہو کر دعا وغیرہ مانگتے ہیں۔ صاحبو ہمارے اکابر اس مسئلہ میں بھی ہر طرح سے مخالف اس طائفۂ باغیہ کے ہیں۔ وہ ہمیشہ سفر برائے زیارت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کرتے رہتے ہیں۔"

الشہاب الثاقب: ص ۴۵

جو ذات شریف نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس کی زیارت کو ہی ناجائز اور حرام بتاتی ہو اس سے اولیاء کرام اور عام مومنین کی زیارت کے لیے سفر سے متعلق کیا امید کی جاسکتی ہے۔

اس امتی کی کس درجہ سیاہ بختی ہے کہ وہ اپنے نبیؐ کی زندہ نبیؐ کی، حیاۃ النبیؐ کی ہی زیارت سے ذہناً عقیدۃً وعملاً محروم ہو۔ جب ان سیاہ بختوں کے پاس زیارت روضۂ اقدسؐ حرام ہو تو اس کے لیے سفر! وہ بھی سن لیجیے کہ صاحبِ "انوار الباری" نے شرحِ صحیح بخاری میں ابن تیمیہ کے تفردات گنتے ہوئے بتایا ہے: ان کے پاس

"(۲۴) سفرِ زیارتِ روضۂ مطہرہ معصیت ہے جس میں نماز کا قصر جائز نہیں۔ بڑی شد و مد سے اس فتوے کو لکھا حالاں کہ اس سے قبل مسلمانوں میں سے کوئی بھی اس امر کا قائل نہیں ہوا ہے۔"

انوار الباری: جلد یازدھم: ص ۲۵۔

سمجھے آپ اس مسلمان کو اس عاشقِ رسول کو جو اپنے محبوب اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مطہرہ کی زیارت کے لیے سفر کرنے والے مسلمان کو ان لوگوں نے کتنی بڑی سزا تجویز کی ہے۔ کس قدر دلخراش فیصلہ ہے۔

اللّٰھُمَّ احفظنا

سفرِ زیارتِ روضۂ مطہرہ کے اثبات میں یہاں ہمیں نصِ قرآنِ پاک، احادیثِ شریفہ، ائمۂ اربعہ کے اقوال اجماعِ اُمّت کی تفصیلات پیش کرنے کی گنجائش نہیں۔ اگر آپ اس پر مدلل بحثیں دیکھنا چاہتے ہیں تو "انوار الباری" شرحِ صحیح بخاری کی جلد یازدھم مطالعہ فرمائیں:

آخیر میں عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کے جواز و عدمِ جواز پر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ،

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

کے فتاوی بھی پڑھ لیجیے:

السوال

زیارتِ قبور مستورات کو حرمینِ شریفین میں کیوں اجازت ہوئی؟ حالاں کہ لعن اللہ علی زائرات القبور وارد ہے۔ کسی صورت میں عجم میں عجمیہ مستورات کو جواز ہوگا یا نہیں؟ بینوا توجروا:

الجواب

"عورتوں کے لیے زیارتِ قبور میں تین قول ہیں۔ ایک منع مطلقاً لقولہ علیہ السلام لعن اللہ زائرات القبور دوسرا جواز مطلقاً لقولہ علیہ السلام کنت نہیتکم عن زیارۃ القبور فزوروھا فانہا تزھد فی الدنیا وتذکر الآخرۃ الحدیث قالوا لما نسخ النہی بلغ الرخصۃ للرجال والنساء جمیعًا۔ تیسرا قول تفصیل اس طرح کہ اگر مقصود زیارت سے ندبہ و نوحہ وغیرہ کرنا ہو تب تو حرام ہے وھو مجمل قول علیہ الصلوٰۃ والسلام الاول اور اگر عبرت وبرکت کے لیے ہو تو بوڑھیوں کو جائز ہے ، وھو مجمل قول علیہ السلام الثانی اور جوانوں کو ناجائز جیسا مساجد میں آنا لقول عائشہؓ لو ان رسول اللہ رای ما احدث النساء بعدہ لمنعھن کما منعت نساء بنی اسرائیل۔ یہ تفصیل ردالمحتار میں خیر رملی سے نقل کرکے کہا ہے۔ وھو توفیق حسن اور اس حکم میں عجمیات و عربیات سب برابر ہیں۔ ہماری شریعت سب اسود و احمر کے لیے یکساں ہے۔"

فتاوی امدادیہ: جلد دوم: ص ۱۲۸

حضرت مولانائے موصوف کے فتوی سے آپ کا رجحان زیارت قبور بوڑھیوں کے لیے جائز ہونے اور جوان عورتوں کے لیے ناجائز ہونے کی طرف

معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

سوال

قبور پر عورات کا جانا حرام ہے مگر مکہ شریف اور مدینہ منورہ میں کل زیارات پہ عورات جاتی ہیں اس کی کیا وجہ ہے؟

الجواب

"عورتوں کو قبور پہ جانا مختلف فیہ ہے۔ اکثر علماء منع کرتے ہیں بسبب فساد کے اور جو فساد نہ ہو تو اکثر کے نزدیک جائز ہے حرمین میں اس پہ ہی عمل ہے۔ فقط
واللہ تعالیٰ اعلم۔

فتاویٰ رشیدیہ، ص ۱۲: ج ۲

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے عورتوں کو زیارتِ قبور کی اجازت عدم فساد کی صورت میں دی ہے۔ عورت کے جوان یا بوڑھی ہونے کی قید نہیں لگائی۔ اس بارے میں درحقیقت فساد کا ہونا یا نہ ہونا ہی اصل شئی ہے۔ ابھی ابھی باقیات صالحات ویلور کا فتویٰ بھی نظر سے گزرا وہ بھی پڑھ لیجیے:

سوال:

عورتوں کو قبروں کی زیارت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"عورتوں کو زیارتِ قبور کرنا منع نہیں۔ ردمحتار میں لکھا ہے

لاباس بزیارۃ القبور ولو للنساء لحدیث کنت نہیتکم
عن زیارۃ القبور فزوروھا " انتھی
فتاوی شیخنا: دفتر اول: غیر مطبوعہ: ص ۲۴۶

الجواب صحیح
محمد عبد الجبار عفی عنہ
(آپ علامۂ وقت تھے)

الجواب صحیح
عبدالرحیم عفی عنہ (رباقوی فاضل دیوبند)

مولانا یعقوب صاحب مدرسِ اول دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

" زیارتِ قبور احیانا کرتے رہو اور عوام مومنین کے مقابر میں بھی کبھی کبھی جا کر ان کو فاتحہ اور ثواب سے یاد کرو اور اپنی موت کو یاد کرو "
مکتوباتِ یعقوبی۔ مکتوب نمبر ۳: ص ۴۲

اب اخیر میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی پڑھ لیجئے جو حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب کا ہے:

سوال

زید سنتا ہے کہ فلاں بزرگ کی درگاہ نہایت عالی شان ہے اِس کو سُن کر وہ سفر طے کر کے درگاہ کے دیکھنے کو جاتا ہے۔ یہ دیکھنا کیسا ہے؟

الجواب

" اگر وہاں بدعات و منکرات میں مبتلا نہ ہو تو جائز ہے"

فقط محمد شفیع غفرلہٗ ۔ فتاوی دارالعلوم: ج ۷: ص ۳۴۵

" زیارتِ قبور مستحب ہے ۔ ہر ہفتہ میں ایک دن زیارت کرے ۔ جمعہ یا جمعرات یا ہفتہ یا پیر کے دن مناسب ہے سب میں افضل روز جمعہ وقت صبح ہے ۔ اولیاء کرام کے مزاراتِ طیبہ پہ سفر کرکے جانا جائز ہے ۔ وہ اپنے زائر کو نفع پہنچاتے ہیں اور اگر وہاں کوئی منکرِ شرعی ہو مثلاً عورتوں سے اختلاط تو اس کی وجہ سے زیارت ترک نہ کی جائے کہ ایسی باتوں سے نیک کام ترک نہیں کیا جاتا بلکہ اُسے بُرا جانے اور ممکن ہو تو بری بات زائل کرے "

(ردالمحتار)

بہارِ شریعت: ج ۴: ص ۱۳۲

اب آخیر میں یہ بھی پڑھ لیجیے کہ امیرالروایات میں مولانا شاہ اسحٰق دہلوی سے متعلق لکھا ہے کہ مکہ معظمہ بنیّت ہجرت جب جانے لگے ان کے بعض نیازمندوں نے کہا کہ آپ کے اجمیر جانے سے دوسروں کی ہمّت افزائی ہوگی۔ فرمایا " رقیبوں کے خوف سے محبوب کو نہیں چھوڑ سکتا "

کیا حضرت شاہ صاحب کے اس جملہ کی وضاحت کی ضرورت ہے ؟

خواجہ اجمیریؒ اگر کسی کے محبوب نہ ہوں تو وہ بات اور ہے !!

قبر پر فاتحہ

اور

تلاوتِ قرآنِ پاک

جب ہم زیارتِ قبور کے لئے قبرستان پہنچیں تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ قبروں پر فاتحہ پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اگر آپ کو اس سوال کا جواب حاصل کرنا ہے تو، مندرجہ ذیل فتاویٰ پڑھیے اور مفتیانِ عظام کی رائے عالی کو اچھی طرح گرہ میں باندھ لیجیے۔ اور پھر ایسے ویسوں کی چیخ پکار پر کان نہ دھریئے۔

سب سے پہلے حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی کا فتویٰ پڑھ لیں۔ جن کے فتاوے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بھی "بہشتی زیور" میں نقل فرمائے ہیں۔

> "جب زیارتِ قبر کے لیے جائیں تو وہاں فاتحہ بھی پڑھ لیں"۔
>
> علم الفقہ: ج ۲: ص ۲۱۳

بعض لوگ قبر پر تلاوتِ قرآن پاک کرنے یا نہ کرنے سے متعلق بھی سوالات اٹھاتے رہتے ہیں۔ قبر پر قرآن پڑھنا ظاہر ہے کہ ایصالِ ثواب اور فاتحہ خوانی ہی کے لیے ہوتا ہے اور زیارت قبور سے غرض افادہ و استفادہ ہی ہوتا ہے۔ قرآن پڑھنے میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ اس سلسلہ میں دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ پڑھ لیجیے:

سوال

قبر پر قرآنِ شریف پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"ایصالِ ثواب میّت کے لیے قبر پر قرآنِ شریف پڑھ کر میّت کو ثواب پہنچانا درست ہے۔ کذا فی الشامی" فقط

فتاوی دارالعلوم: ج ۵: ص ۴۴۸

بعض لوگ قبرستان میں قرآن مجید پڑھنے پر بھی تذبذب میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کے لیے مذکور فتویٰ ہی کافی ہے کہ جب قبر پر ہی قرآن پڑھنا جائز ہو تو قبرستان میں کیوں ناجائز ہوگا؟ تاہم ایسے لوگ "کفایۃ المفتی" کا یہ فتویٰ پڑھ لیں
قبرستان میں قرآن شریف تکیہ وغیرہ پر رکھ کر پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"قبرستان میں تکیہ پر کلام مجید رکھ کر پڑھنا جائز ہے"

کفایۃ المفتی

اسی طرح کسی قبر پر اجتماعی طور پر چند لوگوں کا قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی جائز ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھتے ہیں:

مسئلہ

"چند لوگوں کا مقرر کر دینا کہ وہ قبر کے پاس بیٹھ کر قرآن مجید پڑھا کریں اور اس کا ثواب میت کو دیا کریں جائز ہے۔ بشرطیکہ قبر پر بیٹھنا صرف اس غرض سے ہو کہ قرآنِ مجید پڑھنا التزام واطمینان کے ساتھ ہو جایا کرے"

درمختار ردمحتار

علم الفقہ: ج ۲: ص ۲۱۳

بعض لوگوں نے اس سے بہت پہلے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ قبر پر فاتحہ کھڑے ہو کر پڑھیں یا بیٹھ کر! تو حضرت مولانا محمود الحسن فتاوی محمودیہ میں لکھتے ہیں:

الجواب

"حامدًا ومصلیًا کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھے: قال فی الفتح والسنة زیارتها قائماً والدعاء عندها قائماً شامی: ص ۵۴۳۔ اگر کسی کو زیادہ دیر تک ٹھہرنا ہو یا کھڑے ہوتے میں تکان ہو تو بیٹھنا بھی درست ہے۔ اگر زندگی میں بے تکلفی کے تعلقات تھے تو دونوں طرح ٹھیک ہے۔ ینبغی ان یدنو من القبر قائماً وقاعداً بحسب ما کان ینتفع لزوارہ فی حیاتہ: طحطاوی: ص ۲۴۱

فقط واللہ سبحانہٗ تعالیٰ اعلم
فتاویٰ محمودیہ: ج ۲ : ص ۴۰۵

قبر پر فاتحہ بیٹھ کر پڑھنے والوں پر قبر پرست ہونے کا الزام لگانے والوں کو یا تو اپنے مبلغ علم کا جائزہ لینا چاہیے یا اپنی غلطی سے رجوع کر لینی چاہیے۔
فتاویٰ رشیدیہ میں مختلف سوالات میں سے دو سوال پارچہ رنگین لینا اور قبر پر مراقبہ کرنے سے متعلق حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں:

الجواب: جس قدر امور آپ نے لکھے ہیں کوئی جائز ہے کوئی ناجائز! مثلاً پارچہ رنگین میں کوئی گناہ نہیں یا قبر پر بیٹھ کر سر جھکا کر کچھ پڑھے یہ گناہ نہیں۔ فتاویٰ رشیدیہ: ج ۱ : ص ۳

سوال: بعض صوفی قبور اولیاء پر چشم بند بیٹھتے ہیں اور سورۂ الم نشرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا سینہ کھلتا ہے اور ہم کو بزرگوں سے فیض ہوتا ہے۔ اس بات کی کچھ اصل ہے یا نہیں؟

الجواب: اس کی بھی اصل ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ اگر بہ نیت خیر ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم (فتاویٰ رشیدیہ ج ۱: ص ۱۱)

قبر پر جب مراقبہ کیا جا سکتا ہے تو قبر پر بیٹھ کر فاتحہ و ایصال ثواب کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ "صراط مستقیم" میں مولانا شہید نے لکھا ہے کہ "اور

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی قبر پر (سید احمد شہیدؒ) ایک دن مراقب ہوئے
اُن کی روح سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بڑی قوی توجہ کی جس کے سبب سے
نسبتِ چشتیہ حاصل ہونا شروع ہوئی

(جامع الفتاوی: ج دوم: ص ۸۴: بحوالہ صراط مستقیم)

اور حضرت عبداللہ بن دینار فرماتے ہیں: رأیت ابن عمرؓ یقف
علی قبر النبیؐ فیصلی علی النبی وابی بکر وعمر (جمع الفوائد) ترجمہ: حضرت
دینار فرماتے ہیں میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو نبیٔ اکرمؐ کی قبر پر کھڑے ہوئے
اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، ابو بکرؓ اور عمرؓ پہ درود پڑھتے ہوئے دیکھا۔

ان ساری دلیلوں کے باوجود بھی کسی کے اندر اگر یہ جرأت باقی ہو
کہ وہ قبروں پہ (تلاوت فاتحہ و قرآنِ پاک) کا انکار کر دے تو انھیں فاضلِ
دیوبند مولانا عامر عثمانی کا یہ بیان پڑھ لینا اور عبرت حاصل کر لینا چاہئیے:
لکھتے ہیں:

> "جب اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آثارِ صحابہؓ
> سے کھُلّم کھلّا قبروں پہ فاتحہ پڑھے جانے کا ثبوت ملتا ہے تو
> ہماری کیا مجال ہے کہ مطلقاً ناجائز کہہ دیں۔"
>
> (تجلّی جولائی ۱۹۵۱ء)

اس کے ساتھ اگر آپ کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ مولانا عامر عثمانی،
فاضل دیوبند بقلم خود اقرار کرتے ہیں کہ وہ شریعت قبوری کے سخت مخالف ہیں

تاہم قبر پر سورۂ فاتحہ، قل اور درود پڑھنے کو بدعت و معصیت قرار دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ لکھتے ہیں:

> "شریعت قبوری کے سخت مخالف ہونے کے باوجود ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کسی بھی مزار پر فقط جانے اور وہاں فاتحۂ مسنونہ پڑھنے کو بھی بدعت و معصیت قرار دے دیں۔"
>
> "تجلّی دیوبند ۶۷ء جولائی۔

قبروں اور مزاروں پر فاتحۂ مسنونہ ہی تو تھا جو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، اعلیٰ حضرت احمد رضا خانؒ اور بانیٔ باقیات صالحات اور اُن کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا ضیاء الدینؒ احمد ویلوری اور ہمارے تمام اساتذۂ کرام پڑھتے آرہے ہیں۔

اب بات روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آگئی کہ مزاروں پر ہی نہیں مطلقاً ایصالِ ثواب و فاتحہ کے منکر کم از کم اہل السنۃ والجماعۃ نہیں ہیں۔ چناں چہ عقائد النسفیہ میں لکھا ہے: وفی دعاء الاحیاء للاموات وصدقتھم عنھم نفع لھم خلافاً للمعتزلۃ۔ ترجمہ: زندوں کا مُردوں کے لیے دعا کرنا اور ان کی طرف سے صدقہ دینا مُردوں کے لیے مفید ہے برخلاف معتزلہ کے۔ اور قبر پر فاتحہ میں کیا پڑھیں کے سوال کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ارشادِ گرامی آگے گزر چکا ہے۔ ذہن سے نکل چکا ہو تو اس پر اور ایک نظر ڈال لیں۔

○

قبر پر درخت کی شاخ گاڑھنا

میت کو دفن کرنے کے بعد قبر پہ شاخ گاڑھنے پر بھی ہمارے بعض بھائی لے دے کرتے رہے ہیں۔

اس مسئلہ پر سب سے پہلے آپ حضرت مولانا شاہ عبدالشکور فاروقی کا مندرجہ ذیل فتوی اور اس پہ حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

> "قبر پر کوئی سبز شاخ رکھ دینا مستحب ہے[علہ]۔ اور اگر اس کے قریب درخت وغیرہ نکل آیا ہو تو اس کا کاٹ ڈالنا مکروہ ہے۔" 'ردالمختار'؛ علم الفقہ ج ۲ : ص ۲۰۸
>
> علہ (حاشیہ) حدیث شریف میں وارد ہے کہ نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو قبروں پہ ایک تازی شاخ کے دو حصّے کر کے رکھ دئے اور فرمایا: جب تک یہ خشک نہ ہوں گی اس وقت تک اس میت پر عذاب کی تخفیف رہے گی۔ بعض مالکیہ کا قول ہے کہ یہ تخفیفِ عذاب صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک کی برکت سے ہوئی۔ تازی شاخ کی تسبیح وغیرہ کو اس میں دخل نہیں۔ ہر شخص کے رکھنے سے یہ بات حاصل نہیں ہو سکتی۔ مگر

یہ قول بے دلیل ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاصہ
بے دلیل ثابت نہیں ہو سکتا۔"
ردالمحتار: (علم الفقہ حاشیہ: ج ۲: ص ۲۰۸

حضرت مولانا فاروقی نے صاف الفاظ میں اظہار فرما دیا کہ تازی شاخ کی تسبیح وغیرہ کو تخفیفِ عذاب میں دخل نہیں ہے اور یہ حضورؐ کے دست مبارک کا خاصہ ہے کہنا بے دلیل ہے۔ اور یہ خاصہ بے دلیل ثابت نہیں ہو سکتا مطلب یہ کہ اگر یہ خاصہ ہو تو دلیل پیش کیجیے اور دلیل نہیں ہے یوں بھی کوئی بھی قبر پہ درخت کی شاخ لگانے والا شخص یہ سمجھنے کی جرات نہیں کر سکتا کہ اس صاحبِ قبر کے عذاب میں تخفیف میرے اس شاخ لگانے سے ہوگی اور بیچارے شاخ لگانے والے کو اس بات کا پتہ ہی کیا ہے کہ قبر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔
نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو بھی اُمتی قبر پہ شاخ گاڑھے گا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گاڑھے گا اور یہ اتباع کی برکت ہوگی لو بس اور اس کو حضورؐ کا خاصہ کہنا بعض مالکیہ کا قول ہے۔

اب آپ اس مسئلہ پر دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ بھی پڑھ لیجیے: لکھتے ہیں:۔

السوال

بعد دفنِ میت قبر پر شاخ درخت تخفیفِ عذاب کے لئے گاڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"علمائے حنفیہ نے و نیز محققین نے اس کو آں حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص سمجھا ہے اور رفعِ عذاب کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت کی وجہ سے مخصوص کیا ہے۔ لہٰذا احوط اس کا ترک کرنا ہے"

فتاویٰ دارالعلوم دیوبند: ص ۴۱۵

مذکور فتویٰ میں حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن نے بھی شاخ گاڑھنے کو ناجائز نہیں فرمایا بلکہ اس کے ترک کرنے کو زیادہ احتیاط ہے فرمایا ہے نیز فتاویٰ دارالعلوم میں اس فتوی پر اسی صفحہ پر موجودہ مفتی حضرت ظفیر احمد صاحب کا حاشیہ موجود ہے۔ حاشیہ صاف بتارہا ہے کہ دارالعلوم کا موجودہ فتویٰ قبر پر درخت کی شاخ گاڑھنے ہی کا ہے۔ جیسا کہ مسلمانوں میں اس کی عادت ہے۔ حاشیہ آپ بھی پڑھ لیں۔ جو انھوں نے شامی سے نقل فرمایا ہے۔

"ویؤخذ من ذالک ومن الحدیث ندب وضع ذالک ولیقاس علیہ، ما اعتید فی زماننا من وضع اغصان الآس ونحوہ وصرح بذالک ایضا جماعۃ من الشافعیہ وھذا اولی مما قالہ بعض المالکیہ من تخفیف عن القبرین ببرکۃ یدہ الشریفۃ صلی اللہ علیہ وسلم او دعائہٖ لھما فلا یقاس علیہ غیرہ وقد ذکر البخاری ان بریدۃ بن الخطیب اوصی بان یجعل فی قبرہ جریدتان واللہ اعلم۔ ردالمحتار: قبیل باب الشہید مطلب وضع الجرید ج ا ص ۸۴۶

حضرت مولانا ظفیر الدین صاحب کے مذکور حاشیہ سے صاف معلوم ہو گیا کہ جیسا ہمارے زمانے میں قبروں پر شاخ گاڑھنے کی عادت ہے وہ حدیث کی رو سے مستحب ہے۔ اور بعض مالکیہ کے قول سے بھی یہ قول اولیٰ اور افضل ہے اور یہ بھی کہ اگر شاخ گاڑھنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہوتی تو بخاری شریف کی روایت کے مطابق ایک جلیل القدر صحابی حضرت بریدہ بن الخطیب رضؓ اپنی قبر پر شاخ گاڑھنے کی وصیت نہیں فرماتے۔ اس کے باوجود بھی ہمارے بعض بھائی بلاتحقیق شاخ گاڑھنے کی مخالفت کر کے اپنی دانست میں بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ اور گاڑھنے والوں کا مذاق اڑا کر فی الحقیقت خود نشانۂ مذاق بن رہے ہیں۔

نیز ہندوستان کے بہت بڑے عالم حضرت مولانا عبدالحیؒ لکھنوی نے بھی اپنے فتویٰ میں قبر پر پھول ڈالنے اور شاخ گاڑھنے کو مستحب بتایا ہے۔

السوال

برگ سبز یا گُل یا مانند آں بر قبر نہادن سنّت است یا مستحب؟

"بعضے فقہاء این را مستحب نوشتہ اند بدلیل آں کہ آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یکبار بر دو قبر گذشتند کہ صاحب آن دو قبر عذاب کردہ می شدند فرمود کہ ایشان عذاب کردہ می شوند بر چیزے کہ شاق نہ بود بر ایشان پس ایک جریدۂ نخل طلبیدہ درمیان آن شق کردہ یک یک نصف بر آن دو قبر

نہادہ فرمودند یخفف عنہم العذاب مالم ییبسا۔ یعنی مادامیکہ خشک نہ شوند ببرکت تسبیح آن درعذاب صاحب قبر تخفیف خواند شد۔"

مجموعہ فتاویٰ: ج ۳: ص ۶۷

ترجمہ: بعض فقہاء نے قبر پر شاخ گاڑھنے اور پھول ڈالنے کو مستحب لکھا ہے۔ اس دلیل کے مدنظر کہ ایک مرتبہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر دو قبروں پر سے ہوا کہ دونوں قبر والے عذاب میں مبتلا تھے۔ حضورؐ نے فرمایا انھیں ایسی چیز پر عذاب دیا جارہا ہے کہ اُن کے حق میں مشکل نہیں تھی پس حضورؐ نے کھجور کی ایک شاخ منگوائی اور اس کو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم فرمایا اور ایک ایک نصف ان دونوں قبروں پر گاڑھ کر ارشاد فرمایا یخفف عنہم العذاب مالم ییبسا یعنی جب تک کہ یہ خشک نہ ہوجائیں ان کی تسبیح کی برکت سے صاحب قبر کے عذاب میں تخفیف کردی جائے گی۔"

مجموعہ فتاویٰ: ج ۳: ص ۶۷

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کے اس فتوی سے واضح ہوگیا کہ قبر پر شاخ گاڑھنا ہی نہیں بلکہ پھول ڈالنا بھی مستحب ہے جب یہ چیز بڑے بڑے علماء کرام کی رائے میں مستحب ہے تو اس کو بدعت کہنے والوں کی دیدہ دلیری قابلِ دید ہوگی۔

فتاوی عالمگیری جیسی مستند کتاب (جس کے حوالے مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک کے سارے مفتیانِ کرام پیش فرماتے رہتے ہیں۔) میں خود موجود ہے کہ :

> "گلاب کے پھول اور ریاحین قبروں پہ رکھنا اچھا ہے اور اگر پھول کی قیمت صدقہ کردے تو بہت اچھا ہے۔ غرائب میں ہے۔
> ترجمۂ فتاوی عالمگیری: ج ۴: ص ۳۱۹

ردالمحتار اور فتاوی عالمگیری کی اس وضاحت کے بعد بھی کوئی نعرہ لگائے کہ "قبر پہ پھول ڈالنا یا شاخ گاڑھنا جائز نہیں ہے" گستاخی معاف! ایسا نعرہ لگانے والوں کے بارے میں سوچنا پڑے گا کہ آیا یہ عالم ہیں بھی یا نہیں! البتہ یہ کہنا کہ اس کی قیمت کو صدقہ کردینا زیادہ بہتر ہے۔ یہ اور بات ہے اس سے قبر پہ پھول ڈالنا بدعت و ناجائز تو نہیں ہوا؟ صرف قبر پہ ہی نہیں بلکہ میّت کے جنازے پہ پھول ڈالنے سے متعلق مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کا فتویٰ پڑھ لیجیے :

سوال

میّت کے جنازہ پہ پھول ڈال کر نمازِ جنازہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"جنازہ پہ پھول ڈال کر نمازِ جنازہ پڑھنا منع نہیں ہے۔ جائز ہے۔ پھول ڈالے ہوئے جنازہ پہ نماز پڑھنا منع ہے کر کے

کتبِ فقہ میں کہیں دیکھا نہ گیا اور نہ وہ موانع نمازِ جنازہ سے ہے۔
قبر پر پھول ڈالنا اچھا ہے۔ واللہ اعلم۔

کتبہ شیخ آدم عفی عنہ
غیر مطبوعہ دفتر فتاوی شیخنا

الجواب صحیح	الجواب	قد اصاب من اجاب
محمد عبد الجبار عفی عنہ	سید محمد سعید کان اللہ لہ	محمد عبد العلی عفی عنہ

الجواب صحیح
ضیاء الدین احمد امانی عفی عنہ

الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد عمر عفی عنہ	محمد حسن بادشاہ عفی عنہ

حدیث شریف میں ہے: حبب الیّ من دنیاکم ثلاثٌ
یعنی تمہاری دنیوی چیزوں سے تین چیزیں میرے لیے محبوب ٹھہرائی گئی ہیں۔ خوشبو، عورتیں اور نماز میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب خوش بو حضور کو پسند ہو تو ہماری روحوں کو کیوں پسند اور مرغوب نہ ہوگی۔ چناں چہ جب حضرت مولانا عبد العزیز دہلوی رح سے سوال کیا گیا کہ قبر پر پھول ڈالنے سے میت کو خوشی ہوتی ہے تو فرمایا:

الجواب

"محتمل است کہ از نہادن خوش بو سرور بمیت میرسد زیرا کہ دریں حالتِ روح بسیار متلذذ با ستعمال خوش بو می شود۔

ترجمہ: اس کا احتمال ہے کہ اس خوش بو کے رکھنے سے میّت کو سرور حاصل ہو۔ اس لیے کہ اس حالت میں روح خوشبو کے استعمال سے زیادہ لذّت حاصل کرتی رہے۔"

فتاوی عزیزی ملخص: ص ۹۵

روح اس حالت میں زیادہ لذت کیوں حاصل کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ جب تک روح جسم کی قید میں مقید رہتی ہے اس کی طاقت کم ہوتی ہے اور جب جسم سے نکل جاتی ہے تو اس کی طاقت بڑھ جاتی ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرؓ سے پوچھا: عمرؓ اس وقت تمہارا حال کیا ہوگا جب تمہیں قبر میں دفن کیا جائے گا، منکر نکیر آئیں گے، تم سے سوال کریں گے کہ من ربك؟ من نبیك؟ وغیرہ تو حضرت عمرؓ عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! کیا میری عقل اس وقت ٹھیک رہے گی؟ تو نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس وقت تو عقل کی طاقت اور بڑھ جائے گی۔ تو عمرؓ نے جوش میں جواب دیا تھا: تب تو میں ان سے نبٹ لوں گا۔ اس لیے کہ یا رسولؐ اللہ! اس عقل سے جو جسم کی قید میں تھی کم زور تھی میں نے آپؐ کو نبیٔ آخر الزماں کی حیثیت سے پہچان لیا اور مان بھی لیا۔ اور خدا کو ایک جان لیا تو کیا اب عقل کی طاقت بڑھ جانے کے بعد انھیں سوالات کا جواب دے نہ سکوں گا!

شاید یہی وجہ ہو کہ مولانا محمد امجد علی اعظمی نے "بہارِ شریعت" میں قبر پر پھول ڈالنے کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ اس سے "میت کا دل بہلے گا۔"

چناں چہ لکھتے ہیں :

"قبر پر پھول ڈالنا بہتر ہے کہ جب تک تر رہیں گے تسبیح کریں گے اور میت کا دل بہلے گا۔"
(ردالمحتار)

بہار شریعت : ج ۴ : ص ۱۳۴

قبر پر پھول ڈالنے کے سلسلہ میں اب آپ مندرجۂ ذیل مسئلہ پر اکتفا فرمالیجیے :

مسئلہ: "قبر پر پھول رکھنا بہتر و مستحب ہے کہ پھول جب تک تر رہتے ہیں اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں اور صاحبِ قبر کو انس ہوتا ہے۔"
(زیارتِ قبور، از مولانا عبدالعزیز خان فتحپوری)

قبر پر تلقین

بعض ان حضرات کی زبانی یہ سُن کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ جو یہ کہتے ہیں کہ قبر پر تلقین پڑھنا بدعت ہے۔ شاید ان لوگوں کی نظروں سے اس سلسلہ کی نہ احادیث شریفہ گزری ہیں اور نہ ہی انھیں اس بات کا علم ہے کہ یہ قول معتزلہ (ایک بدمذہب فرقہ) کا ہے۔ اہل السنّۃ و الجماعۃ کا نہیں ہے۔

چناں چہ ردالمحتار میں ہے:

ان ھذا علی قول المعتزلۃ لأن الأحیاء بعد الموت عندھم مستحیل اما عند اھل السنۃ فالحدیث ای لقنوا موتاکم لآ الٰہ الا اللہ محمول علی الحقیقۃ (ردالمحتار جلد اول باب صلاۃ الجنازہ ص۵۷۱)

خصوصًا ایسی بات جب ہمارے کسی فاضلِ دیوبند یا فاضلِ باقیات کی زبان سے نکلتی ہے تو ہمیں یہ سوچ کر مزید حیرت ہوتی ہے کہ آخر ان حضرات کو کم از کم اپنے اساتذہ اور استاذ الاساتذہ کی تصنیفات اور فتاوی کا علم ہے بھی یا نہیں؟ اور اس سلسلہ میں ان حضرات نے احادیثِ شریفہ کا جائزہ لیا بھی ہے یا نہیں؟

چناں چہ حدیثِ شریف میں ہے:

عن ابی سعید الخدری عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللہ۔

نیز ابوداؤد کی حدیث ہے:

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیہ فقال استغفروا لاخیکم واسئلوا لہ التثبت انہ الآن یسئل ؛ (ابوداؤد شریف)

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب تدفینِ میّت سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو کر فرماتے: اپنے بھائی کے لیے گناہوں سے مغفرت طلب کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا کرو۔ اس لیے کہ اب اس سے سوال کیا جا رہا ہے۔

ابوداؤد کی یہ حدیث تلقین میّت بعد دفن پر کھلی دلیل ہے اور اہل السنّۃ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے۔ البتہ بعض لوگوں نے لقنوا موتاکم لا الٰہ الا اللہ والی حدیث کو مجاز پر محمول کر کے تلقین قریب الموت مراد لی ہے لیکن علمائے محققین نے لقنوا موتاکم کو حقیقت پر محمول کر کے تلقین بعد دفنِ میّت مراد لی ہے۔ اور بتایا ہے کہ جب معنی حقیقی مراد لیا جا سکتا ہو تو مجاز کی حاجت نہیں ہے۔ بہرحال مختلف احادیث شریفہ کے پیشِ نظر قریب الموت کی تلقین اور قبر پر دفن کے بعد تلقین دونوں درست ہیں۔ لیکن اھل السنّۃ والجماعۃ کے برخلاف معتزلہ (ایک بدمذہب فرقہ) نے قبر پر تلقین کا صاف انکار کر دیا ہے۔ اور مرنے کے بعد زندہ کرنے کو محال بتایا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب آپ فتاوی دارالعلوم کا یہ سوال و جواب ملاحظہ فرمائیں۔

السوال

درمختار کی روایت ولا یلقن بعد تلحیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تلقین کرنا نہ کرنا بعد دفن کے برابر ہے۔ مگر شامی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد دفن تلقین نہ کرنا معتزلہ کا مذہب ہے۔ شامی ذکر فی المعراج انہ ظاھر الروایہ ثم قال .... الکافی عن الشیخ الزاھد الصفار ان ھذا علی قول المعتزلۃ لان الاحیاء بعد الموت عندھم مستحیل اما عند اھل السنۃ فالحدیث ای لقنوا موتاکم الحدیث پوری تشریح سے مطمئن فرمائیے:

الجواب

"معتزلہ کا قول تلقین بعد التلحید کی ممانعت اور استحالہ کا ہے۔ اور اہل سنت وجماعت کے مذہب کا حاصل یہ کہ ممنوع نہیں ہے بلکہ حسبِ تحقیق محققین اولی تلقین بعد التلحید ہے اور فی الحقیقت حدیث لقنوا موتاکم مجاز پر محمول ہے یعنی قریب الموت کو میت فرمایا لیکن حقیقت پر محمول کیا جائے تو کچھ استحالہ نہیں ہے اور وہ بھی جائز ہے۔ یعنی تلقین بعد تلحید بھی جائز ہے اور اس میں کچھ استحالہ اور ممانعت نہیں ہے۔ کما یقولہ المعتزلہ" فقط

فتاوی دار العلوم: ج پنجم کتاب الجنائز صـ ۲۶۲

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت مفتیؒ دار العلوم نے صاف لکھ دیا ہے

کہ جب تحقیق محققین تلقین بعدِ دفن ہی اولیٰ ہے اور واضح الفاظ میں لکھ دیا ہے کہ معتزلہ دفن کے بعد تلقین کو منع کرتے ہیں۔ جب تلقین بعد دفن محققین علماء کا قول ہو اور اولیٰ بھی ہو۔ نیز بعد دفن تلقین کی ممانعت اور اس کا انکار معتزلہ کا قول ہو تو بھلا بتلائیے کہ ہم اہلِ سنّت و جماعت کے قول کو کیوں ترک کریں اور ایک بد مذہب فرقہ کی تقلید کیوں کریں ؟

اب جب کہ آپ دارالعلوم کا مذکور فتویٰ پڑھ چکے ہیں تو جنوبی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ باقیات صالحات کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیں :

السوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین ان مسائل کے متعلق :

۳۔ تلقین پڑھنا، فاتحہ پڑھنا چالیس قدم ہٹ کر یا قبرستان کے دروازے تک آکر فاتحہ دینا کیسا ہے ؟

الجواب

"تلقین و فاتحہ یعنی دعا بھی جائز ہے۔ چناں چہ اس میں رزاد الآخرۃ) لکھا ہے "تلقین میّت بعد دفن نزدِ اہل السنۃ مشروع است" انتہی۔ اور اس میں (زاد الآخرت) ہے " در اخبار آمدہ کہ دعا بعد دفن برائے شفاعتِ میّت مستحب است" انتہی۔ اور بعد دفن چالیس قدم آکر یا مقبرے کے دروازے تک پہنچ کر فاتحہ، سورہ فاتحہ و اخلاص وغیرہ پڑھ کر دعا کرنا جو اکثر بلاد میں مروّج ہے بدستور میّت کے گھر آکر فاتحہ پڑھنا کتب

فقہ میں اس کا ذکر ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ سنّت نہیں ہے۔ اگر اس کو سنّت واجب سمجھتے ہوں تو بدعت ہے۔ اس کو ترک کرنا چاہیے اگر مباح سمجھ کر کرتے ہوں تو منع نہ ہوگا۔"

(فتاویٰ شیخنا باقیات صالحات: ص ۱۵۳۔ دفتر غیر مطبوعہ)

جب قبر پہ تلقینِ میّت اہلِ سنت والجماعت کا مذہب ہو تو پھر ظاہر ہے کہ تمام علمائے اہلِ سنّت وجماعت کا فتویٰ اس کے جواز ہی کا ہوگا۔ سوائے معتزلہ کے۔ تاہم آپ "بہارِ شریعت" کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیں لکھتے ہیں:

"دفن کے بعد مردے کو تلقین کرنا اھل سنّت کے نزدیک مشروع ہے۔ (جوہرہ) یہ جو اکثر کتابوں میں ہے کہ تلقین نہ کی جائے یہ معتزلہ کا مذہب ہے کہ انھوں نے ہماری کتابوں میں یہ اضافہ کر دیا ہے"

بہارِ شریعت: ص ۱۳۳: ج ۴

اب آپ ہی سوچیئے کہ اس طرح بددیانتی سے کام لے کر دوسروں کی کتابوں میں اپنی مرضی کے موافق اضافے کرنے والے بد مذہب لوگ نہ ہوں تو اور کیا ہوں گے؟ میرے ناقص خیال میں تلقینِ میّت بعد دفن کی فقہی حقیقت سمجھنے کے لیے مذکورہ معروضات ہی کافی ہیں۔

قبر پر کتبہ

قبروں پر کوئی نشان یا علامت لگانا اس سے یہ معلوم ہو کہ یہ فلاں کی قبر ہے تاکہ خصوصی طور پر صاحب قبر کو ایصال ثواب کیا جاسکے یا صاحب قبر متقی و پرہیزگار اور اولیاء اللہ میں سے ہونا معلوم ہو تو ان کی قبر پر مراقبہ کیا جاسکے یا اُن کے وسیلہ سے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی جاسکے علمائے کرام اور فقہائے عظام نے جائز ٹھہرایا ہے۔ اس حدیث کے پیشِ نظر کہ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعونؓ کی قبر پہ پتھر لگانے کا حکم دیا تھا اور فرمایا تھا:

اعلم بہ قبر اخی یعنی میں اس کے ذریعہ اپنے بھائی کی قبر کو معلوم کرلوں گا۔

چناں چہ مدرس مدرسۂ باقیات صالحات حضرت مولانا عبدالقادر بادشاہؒ اپنی کتاب "الباقیات" میں لکھتے ہیں:

> مسئلہ: "امام بزازی نے کہا ہے کہ قبروں کا نشان باقی رہنے کی غرض سے اگر قبروں پر کچھ لکھ دیا اور وہ تحریر کھندلنے وغیرہ سے ذلیل نہ ہوتی ہو تو اس کا مضائقہ نہیں ہے۔"
>
> الباقیات: ص ۱۴۱

پھر اسی صفحہ پر دوسرے مسئلہ کے تحت رقمطراز ہیں کہ:

مسئلہ: "یادداشت کے واسطے قبروں پر پتھر لگانا جائز ہے۔ چناں چہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کی قبر پر پتھر لگانے فرمائے۔"

اعلم بہ قبر اخی دالباقیات: ص ۱۴۱

اور حضرت مولانا عبدالحئی لکھنوی کا فتویٰ بھی جواز پر ہے۔ چناں چہ وہ اپنے فتاویٰ میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں۔ سوال وجواب حسب ذیل ہے۔

سوال

کتابت بر قبر برائے بقائے نشان چہ حکم دارد؟

ترجمہ: نشان باقی رکھنے کے لیے قبر پر کتابت کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب

"مضائقہ ندارد در ذخیرۃ العقبیٰ می آرد وقال فخر الاسلام فان احتیج الی الکتابۃ حتیٰ لایذھب الاثر فلا بأس بہ ایضا کذا فی البیانیہ" انتہی۔ مجموعہ فتاوی: ج ۳: ص ۶۷

ترجمہ: "مضائقہ نہیں ہے۔ "ذخیرۃ العقبیٰ" میں لکھا ہے: اور فخر الاسلام نے کہا ہے کہ اگر کتابت کی حاجت ہو تاکہ قبر کی علامت مٹ نہ جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔"

مزید وضاحت اور تیقن کے لیے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ملفوظ بھی پڑھ لیں:

ملفوظ: "ایک صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ آج کل تو یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ ہو جائیں، سب کچھ کہلائے جانے لگیں۔ اور کام کے نام صفر۔ لمبے لمبے چوڑے چوڑے القاب ہوں جیسے آج کل امیر شریعت، امیر الملّت، امام الہند شیخ التفسیر ہمارے بزرگ بحمد اللہ سب کچھ تھے۔ مگر ان کے لیے کبھی مولانا اور مولوی سے آگے کوئی القاب ہی استعمال نہیں کیا گیا۔ مجکو تو ان تمام نئی چیزوں، نئے خطابات اور القاب سے نفرت ہے۔ ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پہ دیوبند میں جو کتبہ لگا ہے اس پر شیخ الاسلام کا لقب لکھا دیکھا ہے۔ فرمایا کہ نیا لقب نہیں پرانا لقب ہے۔ اس سے وحشت نہیں ہوتی۔"

افاضات الیومیہ: حصۂ ہفتم: ج ۹ ۷

اس ملفوظ سے واضح الفاظ میں معلوم ہو گیا کہ بانیٔ دارالعلوم دیوبند مولانا قاسم نانوتوی کے مزار پر بھی کتبہ لگا ہے تو پھر ہم سے کس کو انکار کی مجال ہو گی۔ لیکن فتاوی دارالعلوم میں لکھا ہے:

الجواب

"پتھر پر آیاتِ قرآنیہ کندہ کرا کر قبر پر لگانا اس طرح تاریخ وغیرہ پتھر پر لکھ کر قبر پر لگانا جائز نہیں ہے۔ اس میں قرآنِ شریف کی بہت بے حرمتی ہے اور اس کا وبال لگانے والے پر ہے۔" فقط

فتاوی دارالعلوم دیوبند : عزیز الفتاوی

ج ۷ : ص ۲۰۱

ہم جب کہتے ہیں کہ فروعی مسائل میں اختلاف کا سبب یا تو فقہاء کے آراء کے اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے یا فقہائے کرام کے اس قاعدۂ کلیہ کی وجہ سے کہ "تتبدل الاحکام بتبدل الزمان" یعنی زمانے کے بدلنے سے احکام بدل جاتے ہیں۔" (یہ قاعدہ فروعی مسائل میں ہے۔) تو افسوس ہے کہ بعض ہمارے بھائی بلا سوچے سمجھے ہمارا مذاق اڑاتے ہیں۔ اس لیے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی دو تین نظیریں پیش کر دی جائیں۔ چنانچہ ابھی ماضی قریب میں یعنی ۱۹۹۰ء کی ابتدا میں مزارات کے کتبوں کے سلسلہ میں ایک قابلِ مذمت حادثہ پیش آیا تھا۔ جو اخبارات میں بھی چھپ چکا ہے۔ آپ کی معلومات کے لیے روز نامہ "مسلمان" مدراس ۲ کا اقتباس پیشِ خدمت ہے:

"دیوبند میں افسوس ناک حادثہ"

"دیوبند (بذریعہ ڈاک) ۱۴/۱۵ جنوری کی درمیانی رات

میں کچھ ناپسندیدہ عناصر نے دیوبند اور دارالعلوم دیوبند کی پرسکون فضا مکدر کرنے کے لیے حضرت نانوتوی، حضرت شیخ الہند حضرت شیخ الاسلام اور حضرت حکیم الاسلام رحمہم اللہ کے مزارات کے علاوہ قبرستانِ قاسمی میں واقع اکثر اکابر و اساتذہ کی لوحِ مزارات کو منہدم کر دیا۔ جس کی وجہ سے دارالعلوم اور شہر دیوبند کی فضا مکدر ہو گئی اور پھر ایک مشتعل ہجوم نے دیگر مقامات پر توڑ پھوڑ کی کوشش کی۔ مگر اساتذۂ دارالعلوم اور شہرِ دیوبند کے بااثر اور معزز لوگوں نے بروقت مداخلت کر کے حالات کو بگڑنے سے بچا لیا۔ مزارات کے ساتھ اس طرح کی توہین آمیز فعل پر حضرت مہتمم صاحب اور تمام اساتذہ نے دلی رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اس کی پرزور مذمت کی اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کی ہدایت پر دوبارہ کتبات کو ان کی جگہوں پر نصب کرا دیا گیا۔"

(روزنامہ "مسلمان" مدراس ع۲۔ بروز جمعہ مورخہ ۶ رجب المرجب ۱۴۱۰ھ فروری ۱۹۹۰ء 90-2-1)

اس مقام پر آپ حیران ہو گئے ہوں گے، ابھی اوپر دارالعلوم دیوبند کا فتویٰ قبر پر کتبہ لگانے کے عدم جواز پر گزر چکا ہے پھر موجودہ مہتمم صاحب نے کتبات کو دوبارہ ان کی اپنی جگہ پر نصب کرنے کی ہدایت کیسے کی؟ اب ہمارا مذاق اڑانے والو یا ہم جیسوں پر طعن و تشنیع کے تیر برسانے والوں سے پوچھنا چاہیئے کہ

اب آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ دارالعلوم کے قدیم فتوے ہیں اور موجودہ مذکور فیصلہ میں قبر پہ کتبہ لگانے پر جو اختلاف کھل کر سامنے آگیا ہے یا یہ اختلاف آراء کی وجہ سے ہے؟ یا تبدل الاحکام بتبدل الزمان کے اصول کی تحت میں ہے؟

یہی نہیں باقیاتِ صالحات ویلور اور دارالعلوم دیوبند کے قدیم دارالافتاؤں کے فتویٰ، نماز میں مکبر الصوت استعمال کرنے کے عدم جواز پہ تھا آج کیا ہے؟

کل دارالعلوم دیوبند کا فتوی فرض نمازوں کے بعد ایصال ثواب فاتحہ پہ عدم جواز پہ تھا، آج کیا ہے؟

جمعہ کے خطبۂ ثانیہ میں خلفاء کے نام لینے سے متعلق دارالعلوم کا قدیم فتویٰ ہے۔

مختصر الجواب

"خلیفۃ المسلمین یعنی سلطان المعظم کا نام خطبہ میں لینا چاہیئے اور ان کے لیے دعائے نصرت وفتح کرنی چاہیے۔ یہ عین اسلامی خدمت ہے۔"

فتاوی دارالعلوم دیوبند: ج ۵: ص ۱۰۳

اب آپ اسی فتوٰی پہ دارالعلوم کے موجودہ مفتی مولانا ظفیرالدین صاحب کا حاشیہ بھی پڑھ لیجیئے۔

لکھتے ہیں:

"یہ ۱۳۴۰ھ کی بات ہے اس زمانہ میں خلیفۃ المسلمین ترکی میں تھے۔ اب یہ ۱۳۸۱ھ ہے اب خلیفۃ المسلمین باقی نہ رہے۔ سلطان عبدالحمید کے بعد پھر کوئی ان کی جگہ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے نہ بیٹھا۔ اس لیے ہمارے اس دور میں کسی کے نام لینے کی ضرورت نہیں البتہ جب کبھی کوئی خلیفۃ المسلمین منتخب کر لیا جائے گا اس کا نام خطبہ میں لیا جا سکے گا۔" واللہ اعلم ۱۲

ظفیر

اب لگے ہاتھوں جمع بین الصلاتین سے متعلق بھی دارالعلوم دیو بند کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے:

سوال ۱۴۰

سفر حجاز میں اونٹ پر بیٹھ کر نماز ہو سکتی ہے یا نہیں؟

الجواب

"سفر حجاز میں اونٹ پر نماز درست نہیں ہے۔ لیکن علمائے حنفیہ حرمین شریفین کا فتویٰ اس پر ہے کہ وہاں جمع بین الصلاتین کر لینا درست ہے۔ مغرب کے وقت قافلہ ٹھہرتا ہے اگر عشاء کے وقت پھر اترنا دشوار ہو تو مغرب کے وقت میں مغرب کی نماز کے بعد عشاء کی نماز بھی پڑھ سکتے ہیں اسی طرح ظہر و عصر کو جمع کر سکتے ہیں۔ فقط

فتاوی دارالعلوم دیوبند: ج ۵: ص ۷۰

اس فتوی پر دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مفتی مولانا ظفیرالدین صاحب کا حاشیہ یہ ہے:

"یہ فتوی اس زمانہ میں تھا جب حجاز میں امن وامان باقی نہ رہ گیا تھا۔ الحمدللہ اب یہ حالت نہیں ہے۔ اب پورا امن وامان ہے لہذا اب یہ جمع بین الصلاتین کا فتوی بھی باقی نہیں رہا سوائے عرفہ ومزدلفہ کے موقع کے۔"

واللہ اعلم ظفیرالدین

طول بیان سے بچنے کے لیے اس موضوع پر یعنی "تبدل الاحکام بتبدل الزمان" پر فتاوی مختصر حوالوں کے ساتھ ملاحظہ فرمالیجیے:

نوٹ کے بارے میں وجوب وادائے زکوٰۃ کے بارے میں دارالعلوم دیوبند کا قدیم فتوی یہ ہے:

"نوٹ جب کہ بقدر نصاب ہوں زکوٰۃ واجب ہے مگر زکوٰۃ میں نوٹ دیں تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔"

ملخص: ج ۶: ص ۸۳

موجودہ فتوی: "نوٹوں سے زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے۔ (موجودہ مفتی ظفیرالدین صاحب)

نامرد شوہر اگر خوشی سے طلاق نہ دیتا ہو تو زوجہ کے لیے شرعاً کیا حکم ہے؟
کے جواب میں دارالعلوم دیوبند کا قدیم فتویٰ یہ ہے:

"اگر شوہر طلاق نہ دے تو کوئی صورت علیحدگی کی نہیں۔"
ج: ۱۰: ص: ۲۱۷

اسی کا حاشیہ یعنی موجودہ فتویٰ

بعد کے علماء نے مسلم پنچایت کو قاضی کے قائم مقام تسلیم کیا ہے۔ وہ پنچایت قاضی کے فرائض انجام دے گی۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: "الحیلۃ الناجزہ" ظفیر

"روپیہ منی آرڈر میں بھیجنا درست نہیں ہے۔" فقط واللہ اعلم۔ فتاوے رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۲۷

اب آپ ہی سوچیے کہ موجودہ فتوے اور عمل سارے علماء کا کیا ہے

"بینک میں روپیہ داخل کرنا درست نہیں ہے۔"
فتاوی رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۲۷

"نماز میں عینک لگانا مکروہ ہے"

امداد الفتاوی جدید : ج ۱: ص ۴۳۹

کیا آج کا فتویٰ بھی وہی ہے ؟

احقر اس موضوع پر اتنے حوالے کافی سے زائد سمجھتا ہے۔

وما علینا الا البلاغ

قبر میں متبرک کپڑے وغیرہ رکھنا

سوال

بہشتی زیور اختری ج ۲ صفحہ ۵۵ کفنانے کے بیان میں مسئلہ ۹ میں لکھا ہے کہ "کعبہ شریف کا غلاف یا اپنے پیر کا رومال وغیرہ کوئی کپڑا تبرکاً رکھ دینا (قبر میں) درست ہے۔"

اس سے فائدہ کیا ہے؟ اور اس کی افادیت کی کیا دلیل ہے اور صحابہؓ و تابعینؒ میں اس کی کوئی نظیر نہیں۔ عبداللہ ابن ابی کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتہ جو دیا گیا تھا وہ محض بدلہ تھا اس کرتے کا جو اس نے حضرت حمزہؓ کے کفن کی تنگی کے وقت اپنا کرتا دے دیا تھا۔ ورنہ جہاں تک فائدہ کا تعلق ہے خود ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "معالم التنزیل میں یہ نقل کیا ہے کہ: "میرا کرتا اُسے کیا فائدہ دے گا؟" یہ بات کچھ بریلوی رنگ کی معلوم ہوتی ہے۔ کیا اس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے؟

(محمد عبداللہ دہلوی: ۱۴۸۰۔ حضرت نظام الدین دہلی ۱۳)

الجواب

"حامدا ومصلیاً" مشکوٰۃ شریف باب غسل المیت و تکفینیہ ص۱۴۳ میں متفق علیہ حدیث ام عطیہ سے مروی ہے کہ حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صاحبزادی کو غسل دیتے وقت ارشاد فرمایا کہ جب غسل دینے سے فارغ ہو جاؤ تو مجھ کو خبر دینا۔ فلما فرغ اذنّاہ فالقی الینا حقوہ فقال اشعرن ایاہ الحدیث۔ اور محدث دہلوی "لمعات" میں فرماتے ہیں هذا الحدیث فی التبرک بآثار الصالحین ولباسهم کما یفعله بعض مریدی المشایخ من لبس اقمصهم فی القبر (واللہ اعلم هامش المشکوٰۃ) ملا علی قاری فرماتے ہیں: قال الطیبی ای اجعلن هذا الحقو تحت الکفن بحیث یلاصق بشرتها والمراد ایصال البرکۃ (مرقاۃ: ج ۲: ص ۳۴۴)

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری جلد ۳ ص۱۰۵ میں لکھا ہے: وهو اصل فی التبرک بآثار الصالحین: بخاری شریف میں روایت ہے عن سهل ان امرأۃ جاءت النبی صلی اللہ علیه وسلم ببردۃ منسوجۃ فیها حاشیتها تدرون ما البردۃ قالوا الشملۃ۔ قال نعم قالت نسجتها بیدی۔ وجئت لاکسوکها فاخذها النبی صلی اللہ علیه وسلم محتاجا الیها فخرج الینا وانها ازارہ فحسنها فلان فقال اکسیها ما احسنها فقال القوم ما احسنت لبسها النبی محتاجا الیها ثم سألته وعلمت

انه لایرد قال انی واللہ ماسالتہ لالبسہا انما سالتہا لتکون من کفنی قال سہل فکانت کفنہ۔ اس پر حافظ عینیؒ تحریر فرماتے ہیں: فیہ التبرک بآثار الصالحین اھ کذا فی عمدۃ القاری ج ۴: ص ۷) کفر کے موجود ہوتے ہوئے کوئی تبرک ذریعہ نجات نہیں بن سکتا۔ اس لیے ابن ابی رئیس المنافقین کو قمیص مبارک سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار الآیہ۔ مومن کو کافر پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے حسنات پر اجر و ثواب آخرت میں موعود ہے۔ اور کافر کے حسنات پر آخرت میں وعدہ نہیں بلکہ اس کی شان کسراب بقیعتہ یحسبہ الظمآن ماء اور مومن کے لیے تو شوکۃ یشاک پر بھی اجر ہے۔ عبداللہ بن ابی نے حضرت عباسؓ کو کرتہ دیا تھا جب کہ وہ بدر سے اسیر کر کے لائے گئے تھے۔ کما صرح القاری فی المرقاۃ: ج ۳: ص ۳۵۰۔ فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم: (فتاوی محمودیہ: ج ۲: ص ۴۱۸)

مذکور فتوی میں سائل کا روئے سخن اور سامنے والوں کے ساتھ بدگمانی کا افسوس ناک انداز آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہے۔ مگر حضرت مفتی صاحب نے مشکوٰۃ بخاری و مسلم اور ان کی شروحات مرقاۃ، فتح الباری، عمدۃ القاری وغیرہ سے قبر میں کفن میں آثار الصالحین رکھنے اور ان کے ذریعہ نجات ہونے سے متعلق ناقابلِ تردید دلائل پیش کر کے ساری بدگمانیوں کا ازالہ فرما دیا ہے اور اس طرح آپ نے بہشتی زیور کے فتوی کی تصدیق بھی فرما دی۔

اور آبِ زمزم میں ترکردہ کفن کے جواز اور عدم جواز کے سوال کے جواب میں حضرت مولانا کفایت اللہ لکھتے ہیں :

جواب (۸)

"کفن مبلول بمائے زمزم میں میرے نزدیک جواز کی جہت راجح ہے۔ اور اس کے استنجاء بمائے زمزم پر قیاس نہ کرنا چاہیئے، کیوں کہ استنجاء میں عین زمزم کی تعریض للنجاست ہے اور ثوب مبلول بماءِ زمزم میں ماءِ زمزم بصورتہ موجود نہیں ہے خشک ہو چکا ہے۔ صرف کپڑے کا اس کے ساتھ گزشتہ زمانے میں تلبس ہوا ہے اور اس قسم کے تلبس کو عدم جواز تکفین میں داخل نہیں۔ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عبداللہ ابن ابی کو قمیص مبارک پہنانا ہی ایک واقعہ نہیں ہے بلکہ صاحبزادی زینبؓ کو اپنا (حقو) تہ بند عطا فرمانا اور اشعرن ایاہ کی ہدایت فرمانا اور ایک صحابی کا حضورؐ سے تہ بند مانگ لینا اور صحابہ کرامؓ کی طرف سے اظہارِ ناراضی پر ان کا یہ عذر ما سألتہ لا لبسھا ولکن لیکون کفنی اور راوی کا یہ بیان فکانت کفنہ بخاری میں موجود ہے۔ اس لیئے تکفین ثوب مبلول بمائے زمزم تو تکفین بقمیص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دازارہ وحقوہ سے اھون ہے۔

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ دہلی۔

کفایۃ المفتی: ج ۴: ص ۲۳

مذکورہ دونوں فتوؤں سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ آثار صالحین کو تبرک کے لیئے اور میت کی نجات کا ذریعہ بننے کے لیئے میت کے کفن میں استعمال کرنا بخاری ومسلم کی صحیح احادیث سے ثابت ہے ۔

نیز حضرت غزالیؒ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ

"وفات کے وقت حضرت امیر معاویہؓ نے یزید کو وصیت کی کہ دیکھو خزانے میں ایک رومال میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑوں میں سے ایک کپڑا ہے اور آپؐ کے موئے مبارک اور ناخن مبارک کے ٹکڑے ہیں یہ ٹکڑے میری ناک میں، میرے منہ میں، میرے کان میں اور میری آنکھوں میں رکھنا اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کپڑا میری جلد پہ رکھنا، کفن میں نہیں ۔"

احیاء العلوم : ج ۴ : ص ۴۸۰

لیکن حضرت مولانا عبدالعزیز دھلوی نے قبر میں شجرہ رکھنے کی دوصورتیں بیان فرمائی ہیں ۔ لکھتے ہیں :

"شجرہ در قبر نہادن معمول بزرگان است ایں را دو طریق است اول ایں کہ بر سینۂ مردہ در کفن یا بالائے کفن گذارند، ایں طریق را فقہا منع میکنند ومیگویند کہ از بدن مردہ خون وریم سیلان میکند وموجب سوء ادب باسمائے بزرگان میشود ۔

وطریق دوم اینست کہ جانب سر مردہ اندرون قبر طاقچہ بگذارند و دراں کاغذ شجرہ رانہند۔

ترجمہ: قبر میں شجرہ رکھنا بزرگوں کا معمول ہے۔ لیکن اس کے دو طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ مُردے کے سینے پر کفن کے اندر یا کفن کے اوپر رکھ دیں اس طریقے کو فقہا منع کرتے ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ قبر کے اندر مُردے کے سرہانے کی جانب محراب بنائیں اور اس میں شجرہ کا کاغذ رکھ دیں۔ فتاوی عزیزی ص ۱۸۳

(بحوالہ ترجمہ شرح برزخ)

مذکورہ فتوی میں حضرت مولانا نے قبر میں شجرہ رکھنے کی افادیت یا عدم افادیت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ صرف شجرہ قبر میں رکھنے کے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلے کو محض فقہا نے منع کیا ہے دوسرے کو نہیں۔ میرے کہنے کا مطلب یہ کہ شجرہ یا عہد نامہ قبر میں رکھنے کی افادیت میں کوئی شک نہیں ہے ورنہ قبر میں شجرہ رکھنا فضول ہی ہوتا۔

میت کی پیشانی پر بسم اللہ لکھنا جائز ہے یا نہیں؟ کے جواب میں حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی لکھتے ہیں: "درست است" کذا فی الدرالمختار و بعضے از عرفا بسم اللہ نویسانیدہ وصیت کردند کہ در کفن باید نہاد" کذا فی فتح العزیز (مجموعۂ فتاوی) ج ۲: ص ۱۲۳)

حضرت لکھنوی نے بسم اللہ لکھ کر کفن میں رکھنے سے متعلق بعض عارفین کی وصیت کا ذکر کر کے فتح العزیز کا حوالہ دے کر یہ بتا دیا کہ یہ بھی جائز ہے

اور حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

" شاہ عبد العزیز صاحب نے بھی رسالۂ فیض عام میں شجرہ قبر میں رکھنے کو معمولِ بزرگانِ دین بتا کر سرہانے طاق میں رکھنا پسند کیا یہ امر واسع ہے بلکہ ہماری تحقیق سے واضح ہوا کہ کفن میں رکھنے میں جو کلام فقہا بتایا گیا وہ متاخرین شافعیہ ہیں۔ ہمارے ائمہ کے طور پر یہ بھی روا ہے ہاں خروج عن الخلاف کے لیے طاق میں رکھنا زیادہ مناسب و بجا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ جل مجدہ اتم واحکم "

فتاوی رضویہ : ج ۴ : ص ۱۳۷

بس بات سمجھنے اور مسئلہ کی حقیقت معلوم کر لینے کے لیے مذکور بزرگوں کے حوالے اور فتاوی احقر کی نظر میں کافی ہیں۔

○

اصحابِ قبور کی فیض رسانی اور ان کا تصرف

یہ مسئلہ اس قدر نازک ہے کہ ہما وشما کی گرفت میں بہت کم آتا ہے۔ الاماشاء اللہ اس مسئلہ کے صحیح طور پر سمجھنے میں بنیادی غلطی شاید ہمارے بعض بھائیوں کا یہ تصوّر ہو کہ روح فنا ہو چکی ہے، مرچکی ہے۔ تو پھر اس کی فیض رسانی کی بات ہی کہاں رہے گی؟ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ روح مرتی نہیں ہے اور نہ ہی اس کو فنا ہے۔ اگر مرچکی ہوتی تو عالم برزخ میں قیام قیامت تک نیک لوگوں کے راحت وسکون میں رہنے اور بُرے لوگوں کے عذاب میں مبتلا رہنے کی بات ہی ختم ہو جاتی اور یہ تصوّر اہل السنۃ والجماعۃ کے عقیدے کے خلاف ہے۔ نیز ہمیں یہ دیکھ کر انتہائی افسوس ہوتا ہے کہ محض ہمارے سیدھے سادے بھائی جو علمائے کرام کی قدر دانی اور اپنی دین داری کا ذکر تو کرتے رہتے ہیں مگر مختلف فیہ مسائل میں جہاں بات ان کی رائے کے خلاف جاتی ہے خدا کو بھول کر ان مسائل کا مذاق اڑانے میں بھی پس وپیش نہیں کرتے۔ حالاں کہ اولیاء اللہ کی قبروں پر مراقبہ کرنے اور اُن سے استفادہ اور فیض حاصل کرنے کے جواز میں سینکڑوں

علماء اہل السنتہ والجماعۃ کے فتاوی موجود ہیں۔ بلکہ چوٹی کے علمائے کرام خود عملاً اولیاء اللہ کی قبروں پر گھنٹوں مراقبے کرتے رہتے ہیں پھر بھی دل کے کسی کونے میں تذبذب ہو تو چاہیئے ان بزرگوں کے فتاوی حوالوں کے ساتھ ملاحظہ فرمالیجیے :

سوال

بعض صوفی قبور اولیاء پر چشم بند بیٹھتے ہیں اور سورۂ الم نشرح پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارا سینہ کھلتا ہے اور ہم کو بزرگوں سے فیض ہوتا ہے۔ اس بات کی کچھ اصل بھی ہے یا نہیں ؟

الجواب

"اس کی بھی اصل ہے، اس میں کوئی حرج نہیں اگر بہ نیتِ خیر ہے" واللہ تعالیٰ اعلم

فتاوی رشیدیہ : ج ۱ : ص ۱۱

یقین حاصل کرنے کے لیے اگر آپ دوسروں کو نظرانداز بھی کردیں تو ہزاروں دیوبندی علماء کے پاس حضرت مولانا گنگوہی کا مقام کیا ہے؟ معلوم کرلیں تو کافی ہے۔ اور یہ شخصیت رقم طراز ہے کہ اس کی بھی اصل ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ یعنی اولیاء اللہ کی قبروں پر مراقبہ کرنے کی بھی اصل ہے اور ان سے فیض حاصل ہونے کی بھی اصل ہے۔ اس کے باوجود بھی کسی صاحب کو اس میں شرک کی بو محسوس ہو رہی ہو تو انھیں حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی فاضلِ دیوبند کے اس بیان سے مشامِ جان کو معطر کرلینا چاہیے۔

فرماتے ہیں :

"خدا جیسے بندوں کی امداد آفتاب کی روشنی ہوا، پانی وغیرہ مخلوقات سے کراتا ہے اگر فرشتوں اور بزرگوں کی روحوں سے بھی اپنے بندوں کی مدد کرے تو اس کو شرک سمجھنا غباوت (کم فہمی) کے سوا اور کچھ نہیں۔"

حاشیہ مقالاتِ احسانی: ص ۴۷

مولانائے موصوف نے عالمِ برزخ سے ارواحِ انبیاء و اولیاء کی جانب سے فیوض و برکات کے حصول کو ناممکن سمجھنے اور پھر اس عقیدہ کو شرک جاننے والوں کو غباوت (کم فہمی) کے ٹائیٹل سے نوازا ہے تو کیا غلط کیا ہے؟ اس سوال کا جواب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے درجِ ذیل بیان سے حاصل کر لیجئے: فرماتے ہیں:

"افاضۂ برزخیہ یعنی اہلِ برزخ سے فیوض و برکات حاصل ہو سکتے ہیں، ہر چند کہ یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ مگر بڑے بڑے لوگ اس کے اثبات کے قائل ہیں اور مشاہدہ کے بعد کیسے قائل نہ ہوتے۔ ہاں اس افاضہ کے لیے مناسبت مفیض و مستفیض میں ہونا چاہیے۔"

حاشیہ مکتوباتِ امدادیہ: از مولانا اشرف علی تھانوی ص ۲۰

حضرت موصوف فرماتے ہیں: اہلِ قبور کے فیوض و برکات کے بڑے بڑے لوگ قائل ہیں اور مشاہدہ بھی ہے۔ بڑے بڑے بزرگ اس کے قائل ہیں ہی اب اگر بزرگوں کے مشاہدہ کا مشاہدہ کرنے والے حضرات انکار کر بیٹھیں اور اس کو شرک سمجھیں تو پھر شاید ان کے لیے مولانا کا ٹائیٹل ہی مناسب ہوگا۔ یہی نہیں آپ ابھی ذرا آگے بڑھیں اور اہلِ قبور کے فیوض و برکات کے ثبوت میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا حدیث سے مندرجہ ذیل استدلال پڑھیں گے تو آپ حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ حضرتِ موصوف اہلِ قبور سے فیض کے سلسلہ میں ایک غیر مقلد عالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ملفوظ ۴۵۴: دو مسئلے بھی پوچھے ایک تو یہ کہ اہلِ قبور سے فیض ہوتا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا ہوتا ہے اور حدیث سے ثابت ہے۔ اس پر ان کو حیرت ہوئی کہ حدیث سے اہلِ قبور سے فیض ہونا کہاں ثابت ہوگا۔ اس لیے کہ ساری عمر حدیث میں گزر گئی۔ کسی حدیث میں نہیں دیکھا۔ میں نے کہا۔ سنیے! ترمذی میں حدیث ہے کہ کسی صحابی نے لاعلمی میں ایک قبر پر خیمہ لگا دیا۔ وہاں ایک آدمی سورہ پڑھ رہا تھا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ نے فرمایا: یہ سورۃ مردے کو عذابِ قبر سے نجات دیتی ہے۔ دیکھیے قرآن سننا فیض ہے یا نہیں؟ اور مردے سے قرآن سنا تو اہلِ قبور سے فیض ہوا یا نہیں؟ بے حد مسرور ہوئے۔ کہا کہ آج تک اس طرف نظر نہ گئی۔" (افاضات الیومیہ: حصہ ششم: ص ۳۹۶)

چلیئے اب آپ حضرات مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی کا بیان کردہ ایک واقعہ پڑھ لیجیے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ایک صاحبِ قبر سے لوگوں نے بے انتہا فیوض و برکات حاصل کئے تھے۔

"فرمایا کہ مولوی معین الدین صاحب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ حضرت مولانا کی ایک کرامت جو بعد وفات واقع ہوئی بیان فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ نانوتہ میں جاڑا بخار کی کثرت ہوئی۔ سو جو شخص ان کی قبر سے مٹی لے جاکر باندھ لیتا تو اسے آرام ہو جاتا۔ بس اس کثرت سے مٹی لے گئے کہ جب بھی قبر پر مٹی ڈالا تب ہی ختم۔ کئی مرتبہ ڈال چکا۔ پریشان ہو کر ایک مرتبہ میں نے مولانا کی قبر پر جاکر کہا کہ آپ کی تو کرامت ہوئی اور ہماری مصیبت ہو گئی۔ یاد رکھیئے اگر اب کوئی اچھا ہوا تو ہم مٹی نہ ڈالیں گے۔ ایسے ہی پڑے رہیو۔ لوگ جوتا پہن کر تمہارے اوپر ایسے ہی چلیں گے بس اسی دن سے آرام نہ ہوا۔ جیسے شہرت آرام کی ہوئی تھی ویسے ہی یہ شہرت ہو گئی کہ آرام نہیں ہوتا۔ پھر لوگوں نے مٹی لے جانا بند کر دیا۔

ارواحِ ثلاثہ: ص ۳۲۲

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اولیاء کرام کی قبر کی مٹی میں بھی شفا

رکھی ہے۔ نیز صاحبِ قبر باہر سے آواز دینے والوں کی آواز بھی سُن لیتے ہیں۔ اوران کی کہی ہوئی باتیں مان بھی لیتے ہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ اور صالحین کی قبروں کی جوار میں دفن ہونا بھی فیوض وکرامات سے خالی نہیں ہے۔ چناں چہ صاحبِ شرحِ سفرالسعادت لکھتے ہیں:

> "ودفن در جوارِ قبر صلحاء و حضور وشہود ساحت عزت ایشان موجب برکت و نورانیت وصفا است"
>
> (شرح سفرالسعادت ص ۲۷۲)

نیز اہل السنۃ والجماعت اولیاء اللہ کے انتقال فرماجانے کے بعد بھی عالمِ برزخ میں ان کے تصرف کے قائل ہیں۔ چناں چہ صاحبِ "تکمیل الایمان" لکھتے ہیں:

> "مشائخ صوفیہ گویند کہ تصرف بعض اولیاء در عالمِ برزخ دائم و باقیست وتوسل واستمداد بارواح مقدسہ ایشان ثابت و موثر ...... و منصرف در حیات و بعد ممات روح است نہ بدن و منصرف حقیقی حق تعالیٰ است و ولایت عبارت از فنا فی اللہ و بقا بدوست واین نسبت بعد از موت اتم و اکمل است"
>
> (تکمیل الایمان: ص ۱۴۲)

یعنی مشائخ صوفیہ کہتے ہیں کہ عالمِ برزخ میں بعض اولیاء کا تصرف دائم

اور باقی ہے اور ان کی ارواح مقدسہ سے توسل و استمداد ثابت اور مؤثر ہے ...... زندگی میں اور موت کے بعد بھی متصرف روح ہے نہ کہ بدن اور متصرفِ حقیقی اللہ تعالیٰ ہے اور ولایت سے مراد فنا فی اللہ اور بقا باللہ ہی ہے اور یہ نسبت موت کے بعد اتم و اکمل ہوتی ہے۔

اگر آپ تصرف اولیاء کے سلسلہ میں مزید دلائل چاہتے ہوں تو فاضلِ دیوبند مولانا عامر عثمانی صاحب کا یہ بیان بھی پڑھ لیں:

> "ہم نہ تو انبیاء علیہم السلام کی لغوی غیب دانی کے انکاری ہیں اور نہ اولیاء اللہ کے کشف و کرامات کو خالص افسانہ تصوّر کرتے ہیں۔ بلاشبہ اولیاء اللہ کو صفائے قلب کے نتیجے میں بے شمار مغیبات کا ایسا علم ہوتا ہے جسے شہود کہا جائے تو غلط نہیں اور ان کی روحانی قوتیں کسی نہ کسی حد تک تصرّف و استمداد بھی رکھتی ہیں۔"
>
> تجلّی: ص ۹۷

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مولانا عامر عثمانی جو شریعتِ قبوری کے سخت مخالف مشہور ہیں اولیاء اللہ کے لیے بے شمار مغیبات کے قائل ہیں اور ان کے اندر تصرفات کی استعداد کو بھی تسلیم کیا ہے۔

اب چلتے چلتے مولانا اسمٰعیل شہید کا بیان اولیاء اللہ کے تصرف سے متعلق پڑھتے چلیں۔

لکھتے ہیں:

"اصحابِ ایں مراتب عالیہ وارباب ایں مناصب رفیعہ ماذون مطلق در تصرف عالم مثال وشہادت می باشند"

یعنی اولیاء اللہ خدا تعالیٰ کی طرف سے عالم مثال وعالم شہادت میں تصرف کرنے کے لیئے ماذون مطلق ہوتے ہیں۔ یعنی مطلقاً اجازت یافتہ ہوتے ہیں۔

صراط مستقیم ص ۱۰۱

چلیئے حضرت مولانا اسمٰعیل شہید نے فیصلہ ہی فرما دیا کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کو نہ صرف عالم شہادت میں بلکہ عالم مثال میں بھی خدائے تعالیٰ نے تصرف کا اختیار دے رکھا ہے۔ چناں چہ مسلم شریف میں ہے:

مررت بقبر موسیٰ فاذا ھو قائم یصلی فی قبرہ (مسلم شریف)

سرکارِ دوعالم فرماتے ہیں: "میرا گزر موسیٰ کی قبر پر ہوا میں نے دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں"۔ قبر میں اذاں دینے، تلاوتِ قرآن پاک کرنے اور نماز پڑھنے سے بڑا تصرف اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں احادیث شریفہ اور مشاھدات سے ثابت ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح رقم طراز ہیں:

"مشائخ چشتیہ نے فرمایا قبرستان میں میت کے سامنے کعبۂ معظمہ کو پیٹھ دے کر بیٹھے گیارہ بار سورۂ فاتحہ پڑھے پھر میت سے قریب ہو پھر کہے یا روح اور یا روح الروح کی دل میں ضرب کرے یہاں

تک کہ کشائش و نور پائے پھر منتظر رہے اوس کا جس کا فیضان
صاحبِ قبر سے ہوئے

شفاء العلیل

روح سے فیض حاصل کرنے کا یہ طریقہ اِن کا اُن کا بتایا ہوا نہیں ہے،
بلکہ یہ اس مقدّس و محترم شخصیت کا بنایا ہوا ہے جن کی علمی عظمت کے سامنے سارے
علماء سرنگوں ہیں۔

اب ندائے "یارسول اللہ" ہی شرک بتانے والے بھائی خود فیصلہ
کرلیں کہ وہ شخص حق پر ہیں یا حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی حق پر ہیں۔
نیز حضرت شاہ صاحبؒ کے فرزندِ ارجمند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز
دہلویؒ اپنی تفسیر "فتح العزیز" میں اولیاء اللہ سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

"ارباب حاجات و مطالب حل مشکلات خود از آنہا می
طلبند و می یابند" یعنی اصحاب حاجات و مطالب اپنی
مشکلات کا حل اولیاء اللہ سے طلب کرتے ہیں اور حاصل بھی کرلیتے ہیں۔

بحوالہ فتاوی رضویہ: ج ۴ : ص ۲۴۳

اور "انکشاف" نامی کتاب کا یہ بیان بھی پڑھ لیجئے جس کے آغاز
میں حضرات مفتیان دیوبند مولانا احمد علی سعید اور مولانا مفتی ظفیر احمد نے تقریظ
لکھ کر اس کی تصدیق کی ہے۔

"اولیائے کرام کی ولایت اور ان کی کرامت ان کی وفات کے بعد بھی باقی اور باذن اللہ جاری رہتی ہے۔ اس ضمن میں اتنا سمجھ لیجئے کہ اللہ کے حکم سے ارواح اولیا دنیا میں بھی آسکتی ہیں اور بحکم الٰہی دوسرے کی مدد بھی کرسکتی ہیں۔"

"انکشاف"، ص ۶۷ بحوالہ "زیروزبر"، ص ۱۳۴

اس کے ساتھ مولانا اخلاق حسین قاسمی صدر جمعیۃ العلماء دہلی کی کتاب "اہل اللہ کی عظمت علمائے دیوبند کی نظر میں" کا ایک اقتباس مولانا ارشد القادری نے اپنی کتاب "زلزلہ" میں نقل فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

"مومن کی روح خاص کر اولیائے حق اور صلحائے اُمّت کی روحیں جسم سے جدائی کے بعد اس عالمِ مادی میں تصرّف کی قوت رکھتی ہیں اور ان ارواح کا تصرّف قانونِ الٰہی کے مطابق ہوتا ہے۔"

"اہل اللہ کی عظمت علمائے دیوبند کی نظر میں"۔ ص ۴۳

اس اقتباس پر مولانا ارشد القادری صاحب نے جو تبصرہ فرمایا ہے فیصلہ کُن ہے۔ لکھتے ہیں تصرف کی قوت اور اس کا استعمال اگر قانونِ الٰہی کے مطابق ہے تو ظاہر ہے کہ اسے شرک قرار دینا یقیناً قانونِ الٰہی سے کھلی ہوئی بغاوت ہے۔ ("زلزلہ"، ص ۲۲۴) ●

مرحوم کے اہلِ خانہ کی تعزیت

دفن کے بعد مرحوم کے اہلِ خانہ کی تعزیت کے لیئے اُن کے گھر جاکر اُن کی تعزیت ادا کرنے اور اُن کے حق میں دعا کرنے اور اہلِ میّت سے مصافحہ کرنے کی عادت چلی آتی ہے۔ لیکن بعض حضرات اس عمل کو عجیب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ گویا ایسا کرنے والے ان کی نظروں میں بدعمل ہی نہیں جاہل بھی ہیں۔ یہی ان کی تیز بینی دلوں میں نفاق پیدا کردیتی ہے۔ ایسا کرنا اگر شرعًا منع ہوتا اور گناہ کی بات ہوتی تو انھیں منع پر سند پیش کرنے یا اس عمل سے روکنے یا اس کو دل میں بُرا سمجھنے کا حق تھا۔ مگر افسوس کہ یہ لوگ ناحق مسلمانوں میں نفاق اور اختلاف کی خلیج کو بڑھا دیتے ہیں۔ آئیے دیکھیں کہ اس پر علمائے کرام مفتیانِ عظام کے آرا کیا ہیں۔ آیا یہ عمل بدعت ہے یا مستحب۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہ عمل ناجائز و بدعت ہوتا ہمارے جلیل القدر اساتیذ کرام اور باقیات صالحات کے مفتی اعظم حضرت استاذنا شیخ آدم رح کو ایسی ہی تعزیت کرتے ہوئے نہ دیکھتے۔ مگر ہم نے دیکھا ہے۔ اس سلسلہ میں آپ سب سے پہلے فتاویٰ رحیمیہ کا فتوی ملاحظہ فرمائیں۔

السوال

میّت کی تدفین کے بعد مرحوم کے اقارب سب لوگ قطار میں کھڑے ہوکر مصافحہ کر کے وداع کرتے ہیں تو شرعاً اس کا حکم کیا ہے ؟

الجواب

"مرحوم کے اہلِ خانہ کی تعزیت زبانی اور تحریری مسنون ہے۔ دفن سے پہلے اور دفن کے بعد بھی۔ (شامی: ج ۱: ص ۸۴۳
اہلِ میّت سے مصافحہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس مصافحہ کو تعزیتی مصافحہ نہ سمجھا جائے۔ (ملخص) فتاوی رحیمیہ: ج ۱: ص ۳۶۸۔

مذکور فتوی سے معلوم ہوا کہ تعزیت تو سنّت ہے ہی اور سوال میں مذکور طریقہ پر تعزیت و مصافحہ دونوں جائز ہیں تو پھر اب کچھ چھان بین کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔

حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب کا ایک فتوٰی جو مسائل اربعین میں موجود ہے۔ سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

سوال

مردے کی ماتم پرسی کو جانا اور وہاں دونوں ہاتھ اٹھا کر سورہ فاتحہ وغیرہ پڑھنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

"ماتم پرسی کو جانا جائز ہے اور مغفرت کی دعا اس کی مانگنا

مستحب ہے اور ایسے ہی مُردے کے وارثین کے لیئے صبر کی دُعا کرنا۔ چناں چہ فتاوی عالم گیری میں مرقوم ہے "ونستحب ان یقال لصاحب التعزیہ غفر اللہ تعالی لمیتک وتجاوز عنہ وتغمدہ برحمتہ ورزقک الصبر علی مصیبتہ واجرک علی موتہ کذا فی المضمرات ناقلا عن الحجۃ واحسن ذالک تعزیۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ ما اخذ ولہ ما اعطی وکل شئی عندہ باجل مسمی اور ہاتھ اٹھانا دعا میں تعزیت کے واسطے ظاہراً جائز معلوم ہوتا ہے۔ حدیث میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا مطلقاً بے قید وقت اور مکان کے ثابت ہوا ہے تو اس وقت بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن خاص کر تعزیت کی دعا میں ہاتھ اٹھانا شرع سے ثابت نہیں"

اردو ترجمہ "مسائل اربعین: ص ۴۸

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت مولانا نے تعزیت کے وقت دعا میں ہاتھ اٹھانے کو غیر ماثور کہنے کے باوجود دُعا میں رفع یدین کی حدیث مطلق ہونے کی وجہ سے تعزیت کی دعا میں بھی ہاتھ اٹھا کے دعا کرنا جائز بتلایا اور اس کے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا اور وہ حدیث یہ ہے: عن السائب بن یزید عن ابیہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ وسلم اذا دعا یدیہ و مسح وجھہ

(رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: سائب بن یزید اپنے باپ یزید سے روایت کرتے ہیں: انھوں نے

کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب دعا فرماتے تو اپنے دونوں دست ہائے مبارک بلند فرماتے تھے اور اختتام دعا پر دستہائے مبارک اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے تھے۔

حصن حصین میں ہے: ان من آداب الدعاء رفع الیدین، ترجمہ: رفع یدین آداب دعا میں سے ہے۔

مذکورہ احادیث کے مدنظر جب دعا میں ہاتھ اٹھانا مطلقاً ثابت ہو یعنی حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ فلاں وقت میں فلاں مکان میں دعا کرو تو ہاتھ اٹھاؤ اور فلاں وقت فلاں مکان میں دعا کرو تو ہاتھ مت اٹھاؤ تو پھر ہم دعا میں ہاتھ اٹھانے سے منع کرنے کا کیا حق رکھتے ہیں؟

نیز قبرستان سے آکر ورثائِ میّت کو صبر کی تلقین کرنا کیسا ہے؟ کے جواب میں فتاویٰ دارالعلوم دیوبند ج ۵: ص ۱۴۱۶ میں لکھا ہے کہ "شامی میں اس کو مکروہ لکھا ہے"، مگر مولانا مفتی ظفیر الدین' دارالعلوم کے موجودہ مفتی نے اس پر جو حاشیہ لکھا ہے اس کو بھی پڑھ لیجئے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ دارالعلوم کا آج کا فتویٰ اس بارے میں کیا ہے؟ لکھتے ہیں:

"اس سے معلوم ہوا کہ رسم کے طور پر آکر بیٹھنا مکروہ ہے لیکن اگر کوئی تلقینِ صبر کے لیئے اپنے تعلق کی وجہ سے آئے تو یہ مکروہ نہ ہوگا۔ واللہ اعلم: ظفیر

اب لگے ہاتھوں اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب کا فتویٰ بھی پڑھ لیجئے۔

مسئلہ: "لوگوں میں رسم ہے کہ میّت کو دفن کر کے اس کے مکان میں آتے ہیں اور کہتے ہیں فاتحہ پڑھ لو۔ پھر کچھ پڑھتے ہیں اور ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ یہ فعل کیسا

ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب

" اصل اس فعل میں کچھ حرج نہیں کہ ایصالِ ثواب سے اموات کی اعانت اور ان کے لیے دعائے مغفرت اور پس ماندوں کو تسکین و تعزیت سب باتیں شرعاً محمود و روا۔ اور چند سطر بعد فرماتے ہیں اور میاں اسحٰق صاحب دہلوی کو تسلیم ہے کہ ہاتھ اٹھانا مطلقاً دعا کے آداب سے ہے تو اس وقت بھی کچھ مضائقہ نہیں رکھتا۔ اربعین میں مسئلہ ۳۲

فتاوی رضویہ: ج ۴: ص ۱۷۷۔

○

سماعِ موتیٰ

یہ بھی ایک معرکۃ الآراء مسئلہ ہے کہ مُردے سُنتے بھی ہیں یا نہیں؟ بعض علماء سماعِ موتیٰ کے مقر ہیں اور بعض منکر۔ ہر فریق اپنے دلائل رکھتا ہے سماعِ موتیٰ کے قائل حضرات بخاری شریف و مسلم شریف کی وہ حدیث سند میں پیش کرتے ہیں جس میں نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میدانِ بدر کے اس سوکھے کنوئیں پر کئی دن بعد تشریف لے آئے جس میں جنگ بدر میں قتل شدہ کافروں کی لاشیں ڈال کر بند کردیا گیا تھا اور انھیں پکارا: اے فلاں ابنِ فلاں، اے فلاں ابنِ فلاں جو وعدہ تمہارے ربّ نے کیا تھا، کیا وہ سچ نہیں ثابت ہوا؟ میرے ربّ نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا وہ سچّا ثابت ہوا ہے۔ تو عمرؓ نے حضور سے عرض کیا، یا رسول اللہ! آپؐ بے رُوح جسموں سے کیسے خطاب فرما رہے ہیں، تو نبئ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے وہ تم سے زیادہ سنتے ہیں۔

نیز بخاری و مسلم ہی کی دوسری حدیث ہے: عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال ان العبد المیت اذا وضع فی قبرہ وتولّی عنہ اصحابہ انہ لیسمع قرع نعالھم۔

ترجمہ: انس رضؓ نبیؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا: جب عبد میّت کو قبر میں دفن کر دیا جائے گا اور ساتھی واپس ہوں گے تو میّت اُن کے جوتوں کی آواز سنتی ہے تو اس کے جواب میں منکرینِ سماعِ موتیٰ قرآنِ پاک کی اِس آیتِ شریفہ کو پیش کرتے ہیں: انك لاتسمع الموتیٰ: تم مُردوں کو سنا نہیں سکتے۔ اس کے جواب میں قائلینِ سماعِ موتیٰ کہتے ہیں کہ قرآن پاک نے موتیٰ کے جسموں کے سننے کی نفی کی ہے۔ روحوں کے سننے کی نفی نہیں کی ہے اور ہماری مراد سماعِ موتیٰ سے سماعِ ارواح موتیٰ ہے نہ کہ اجسام۔

نیز اس آیتِ شریفہ میں موتیٰ سے مراد کفار ہیں جو ہدایت و ایمان کو قبول نہیں کرتے حالاں کہ وہ زندہ ہیں۔ سنتے بھی ہیں، دیکھتے بھی ہیں۔ بہرحال بحث طویل ہے۔ آئیے بجائے اس طویل بحث میں پڑنے کے ہم اس مسئلہ پر مختلف مکتبۂ فکر کے علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کے فتاوی مطالعہ کریں۔

سب سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتوی پڑھ لیجیے۔

سوال

اولیاء اللہ اپنی قبروں میں زندہ ہیں یا مُردہ؟ اور اگر زندہ ہیں تو ہماری آواز سنتے ہیں یا نہیں؟

الجواب

"روح کو حیات ہوتی ہے۔ قبر میں سب کی روح زندہ ہے۔ ولی ہو یا عامی اور سماع میں اختلاف ہے۔ بعض مقر ہیں بعض منکر۔ فقط واللہ اعلم۔ فتاوی رشیدیہ: ج ۱: ص ۱۳

حضرت مولانا فرماتے کہ "قبر میں سب کی روحیں زندہ ہیں" روح زندہ ہے تو اس کو ادراک اور شعور بھی ضرور ہوگا۔ چناں چہ حضرت مولانا عبدالعزیز دہلوی کا جواب بھی پڑھ لیں:

سوال

انسان رابعد موت ادراک وشعور باقی ماند وزائران را خود می شناسد وسلام وکلام ایشاں رامی شنود یا نہ؟

الجواب

"انسان رابعد موت ادراک باقی می ماند بریں معنی شرع شریف وقواعد فلسفی اجماع دارند ...... بالجملہ انکار شعور و ادراک اموات اگر کفر نہ باشد در الحاد بودن او شبہ نیست"

فتاویٰ عزیزیہ: ج ۱: ص ۹۳

ترجمہ: انسان کو اس کی موت کے بعد ادراک باقی رہتا ہے۔ اس پر شرع شریف اور قواعد فلسفی کا اجماع ہے۔ بالجملہ اموات کے شعور وادراک کا انکار اگر کفر نہ بھی ہو تو اس کے الحاد ہونے میں شبہ نہیں ہے۔

حضرت مولانا عبدالعزیز دہلوی نے فتویٰ دے دیا کہ موتیٰ کے شعور وادراک کا منکر کافر نہیں۔

تو ملحد ضرور ہے۔ خدا کی پناہ

حضرت مولانا یعقوب صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند سماعِ موتیٰ سے متعلق لکھتے ہیں:

"احقر کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ مردے سُنتے ہیں اور خاص کر اولیاء و انبیاء کو اس باب میں ایک شان جدا ہے کہ تفصیل اس کی طویل ہے۔" (مکتوباتِ یعقوبی، خط بارھواں: ص۵۸)

یہ معمولی شخصیت نہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین ہیں ان کے نزدیک تحقیق یہی ہے کہ مُردے سُنتے ہیں۔ تو پھر اس اختلاف کو پھیلا کر مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والوں کو آخر ملے گا کیا؟ اب آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے گرامی بھی پڑھ لیجئے۔ جو "الفصل للوصل" میں موجود ہے۔ اس کے مرتب لکھتے ہیں:

"ایک صاحب نے سماعِ موتیٰ کے متعلق دریافت کیا فرمایا (مولانا اشرف علی تھانوی نے) کہ اہلِ کشف تو عموماً سماعِ موتیٰ کے قائل ہیں اور اس مسئلہ میں انھیں کا معتقد ہوں۔ کیوں کہ مجھے ظن غالب ہے کہ موتیٰ سنتے ہیں۔ دیکھئے حدیث میں صاف وارد ہے۔ وانہ یسمع قرع نعالھم یعنی مردہ گورستان میں آنے والوں کے جوتوں کی آواز سنتا ہے۔ اور خبرِ واحد موجبِ ظن ہی ہو سکتی ہے۔" (الفصل للوصل: ص۲۳۷)

حضرت تھانوی نے اپنا فیصلہ اس طرح دے دیا کہ اہلِ کشف تو عموماً

سماع موتیٰ کے قائل ہیں۔ اور میں اس مسئلہ میں انھیں کا معتقد ہوں یعنی میں سماع موتیٰ کا قائل ہوں۔ اس کے ساتھ مہتمم دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کا وہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیں، جو فتاوی دارالعلوم دیوبند کی پہلی جلد کے پیش لفظ میں پیش فرمایا ہے۔ شاید اس کے بعد آپ کو مزید دلائل کی ضرورت نہ رہے:

"حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ ماجد کی قبر میں سے ہر جمعرات کو قرآن شریف کی تلاوت کی آواز سنائی دینے لگی۔ جس کا لوگوں میں چرچا شروع ہوا اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اس قبر کے اردگرد جمع ہونے لگے اور جمگھٹا شروع ہوگیا ... (چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ حضرت مفتی صاحبؒ (مفتیٔ دارالعلوم دیوبند) نے محسوس فرمایا اور ایک دن اس قبر پر تشریف لے گئے مقررہ وقت پر وہ تلاوت کی آواز سنائی دی تو اسی وقت حضرت ممدوحؒ نے فرمایا: "کیوں لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کر رکھا ہے"۔ اس جملہ کا زبان سے نکلنا تھا کہ وہ آواز بند ہوگئی اور پھر کبھی سنائی نہیں دی۔ (اس کے بعد مولانا ظفیر الدین صاحب موجودہ مفتی دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:) کیا ٹھکانا ہے اس تصرف کا جو زندوں سے گزر کر برزخ تک پہنچا ہوا ہو۔ اور قبر والوں پر بھی موثر ہوتا ہو گویا قبر والے برزخ میں بھی ان مربیان دین کے وعظ و پند اور تنبیہ کے مشتاق اور ان پر عمل درآمد کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

مذکورہ واقعہ اور فتاوی کی روشنی میں معلوم ہوا کہ موتیٰ سنتے بھی ہیں اور باہر والوں کی ھدایت پر عمل بھی کرتے ہیں۔ تب ہی تو صاحب قبر نے تلاوت بند کر دی۔ اور آواز آنی بند ہو گئی اور یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ بعض موتیٰ اپنی قبروں میں معطل نہیں ہوتے۔ اپنی اپنی حیثیت کے موافق مختلف عبادتوں میں مشغول بھی رہتے ہیں اور یہ بھی کہ تمام عالم برزخ سے اپنی آواز کو جب چاہے عالم دنیا تک پہنچانے اور جب چاہے اس کو روک لینے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ الحمد للہ علی ذالک۔

اب آپ بریلوی مسلک کے ایک مشہور عالم حضرت مولانا امجد علی صاحب اعظمی رضوی کا فتویٰ بھی سماعِ ارواحِ مومنین سے متعلق پڑھ لیں تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ سماعِ موتیٰ کا مسئلہ میں بھی دونوں فریق متفق ہیں۔

لکھتے ہیں:

"جو کوئی قبر پر آئے اسے دیکھتے پہچانتے، اس کی بات سُنتے ہیں بلکہ روح کا دیکھنا قربِ قبر ہی سے مخصوص نہیں۔ اس کی مثال حدیث میں یہ فرمائی کہ ایک طائر پہلے قفس میں بند تھا اور اب آزاد کر دیا گیا۔ ائمۂ کرام فرماتے ہیں ان النفوس القدسیة اذا تجردت عن العلائق البدنیة اتصلت بالملاء الاعلیٰ وترٰی وتسمع الکل کالمشاھد : بے شک پاک جانیں جب بدن کے علاقوں سے جدا ہوتی ہیں عالم بالا سے مل جاتی ہیں اور سب کچھ ایسا دیکھتی سنتی ہیں جیسے یہاں حاضر ہوں۔ حدیث میں فرمایا

اذامات المومن تجلی سربہ یسرح حیث شاء
جب مسلمان مرتا ہے اس کی راہ کھول دی جاتی ہے۔ جہاں
چاہے جائے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں "روح را
قرب وبعد مکانی یکساں است۔"
بہار شریعت حصہ اول ص۱۸

سماع موتی سے متعلق حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب فرماتے ہیں

۱۔ قبر پر کوئی جاوے مردہ دیکھتا ہے اور جو کچھ کلام کرے وہ سُنتا ہے۔ اور جو ثواب پہنچائے مردہ کو پہنچتا ہے اگر کوئی عزیز یا دوست جائے تو اس کے جانے سے مردہ کو راحت و فرحت ملتی ہے۔ جیسے دنیا میں۔

یہ سب مضامین صحاح احادیث میں وارد ہیں۔ وقد فصّلناھا فی حیاۃ الموت فی بیان سماع الاموات (فتاوی رضویہ: ج ۴: ص ۱۶۳)

خدا بہتر جانتا ہے کہ میری اس تالیف کا مرکزی نقطہ یہی ہے کہ تمام مسلمان فروعی مسائل میں اختلاف و نزاع کے رویہ کو ترک کر کے ایک پلاٹ فارم پر جمع ہوں یا کم از کم ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی خو اپنے اندر پیدا کرلیں اور اپنی طاقت ضائع نہ ہونے دیں۔

چلیئے اس موضوع کا اختتام علامہ حافظ ابن تیمیہ کے فتوی پر کریں جس کے بارے میں مؤلف "انوار الباری" نے اپنی کتاب میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی شیخ الحدیث، دارالعلوم دیوبند کا تاثر فرمایا:

لکھتے ہیں :-

"ان سب کے مطالعہ سے میں اسی نتیجہ پر علی وجہ البصیرۃ پہنچا ہوں کہ اہل السنّت والجماعۃ کے طریقے سے کھلا ہوا عدول و انحراف ان کے اندر موجود ہے۔"

انوار الباری۔ جلد یازدھم: ص ١٩٦

اب آپ کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے!

"ھل یتکلم المیت فی قبرہ فجوابہ انہ یتکلم وقد یسمع ایضا من کلّمہ کما ثبت فی الصحیحین عن النبیؐ انہ قال یسمعون قرع نعالھم وثبت عنہ فی الصحیح ان المیت یسئل فی قبرہ فیقال لہ من ربک وما دینک ومن نبیک وثبت عنہ فی الصحیح انہ نادی المشرکین یوم بدر لما القھم فی القلیب قال ما انتم باسمع لما اقول منھم والآثار فی ھذہ کثیرۃ انتھی ملخصا۔

فتاوی ابن تیمیہ جلد ثانی: ص ١٨٣

ترجمہ: کیا قبر میں میت بات چیت کرے گی تو اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک وہ بات کرے گی اور اس سے تکلّم کرنے والے کے کلام کو سُننے گی بھی جیسا کہ نبیؐ سے صحیحین میں ثابت ہے آپؐ نے فرمایا: موتی قبرستان سے واپس ہونے والوں کے جوتوں کی آواز سُنتے ہیں اور صحیح بخاری میں نبیؐ اکرم سے ثابت ہے کہ بیشک

میّت سے اس کی قبر میں سوال کیا جائے گا۔ اس سے پوچھا جائے گا کہ من ربّك وما دينك ومن نبيك اور بھی نبیؐ سے صحیح بخاری میں ثابت ہے کہ یوم بدر میں جب مشرکین کی لاشوں کو ایک اندھے کنوئیں میں ڈال دیا گیا تو آپؐ نے اُن سے خطاب کیا جب حضورؐ سے پوچھا گیا کہ آیا مُردے بھی سنتے ہیں تو آپؐ نے فرمایا میں ان سے جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ تم سے بھی زیادہ سُنتے ہیں اور سماعِ موتی کے بارے میں آثارِ کثیرہ مشہور ہیں۔" انتھی (ملخصًا)

اب آپ ہی سوچیئے کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے طریقے سے کھلا عدول و انحراف رکھنے والے عالم بھی سماعِ موتی کے قائل ہوں اور علمائے اہل السنہ مثلاً

حضرت مولانا یعقوب صاحب صدر المدرسین دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ

حضرت مولانا امجد علی صاحب اعظمی رضوی

وغیرھم کا ساتھ دیں تو پھر ہمیں سوچنا چاہیئے کہ ترجیح کس کو دی جائے۔ ظاہر ہے قائلین سماعِ موتی کا قول ہی راجح ہے۔

واللہ اعلم بالصواب۔

وسیلہ

وسیلہ سے متعلق سب سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا یہ بیان پڑھ لیں ۔

"اور بعض کا گمان ہے کہ دعا میں توسل ممنوع ہے ۔ یہ گمان بھی غلط ہے ۔ احادیثِ صحیحہ سے اس کا ثبوت ہے ۔ البتہ اللہ تعالیٰ پر کسی کا حق لازم سمجھنا بد اعتقادی ہے ۔"

حاشیہ مکتوبات امدادیہ، از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح ص۵

چناں چہ بخاری شریف میں حضرت عمرؓ کا قول ہے : اللّٰھمّ انا کنّا نتوسل الیک بنبینا فتسقینا فنحن نتوسل الیک بعم نبینا فاسقنا ۔

ترجمہ : اے اللہ! ہم آپ کی بارگاہ میں ہمارے نبی (محمدؐ) کو (بارش برسانے کے لیے) وسیلہ بنایا کرتے تھے اور آپ بارش برسایا کرتے تھے اور اب ہم آپ کی بارگاہ میں آپ کے نبیؐ (محمدؐ) کے چچا (عباسؓ) کو وسیلہ بناتے ہیں پس ہمیں بارش عطا فرمائیے!

اس حدیث سے سطحی نظر والوں کو دھوکا لگا کہ صرف زندہ بزرگوں کا وسیلہ جائز ہے۔ وفات یافتہ بزرگوں کو وسیلہ بنانا جائز نہیں ہے حالانکہ علمائے بریلوی، علمائے دیوبند اور علمائے باقیات صالحات ویلور کے فتاویٰ میں جیسے زندہ بزرگوں کا وسیلہ جائز ہے، ویسے ہی وفات یافتہ بزرگوں کا وسیلہ بھی جائز ہے۔ تو پھر ناجائز کہنے والا کون ہے؟ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہوں تو دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح کا یہ بیان دیدۂ عبرت سے پڑھیں۔ فرماتے ہیں:

> "یہ مقدس اکابر (علمائے دیوبند) ہمیشہ اولیائے کرام و انبیاء عظام سے توسل کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخلصین کو اس کی ہدایت کرتے رہتے ہیں۔ جس کو وہابیہ مثل شرک ناجائز و حرام جانتے ہیں۔ حضرت مولانا نانوتوی ایک قصیدہ طویلہ در بارۂ توسل مشائخ سلسلہ عالیہ چشتیہ صابریہ تحریر فرمایا ہے، جو "امداد السلوک" کے اخیر میں ہے: ؎
>
> بحق مقتدائے مقتدایان — حسن بصری امام پیشوایاں
>
> بحقِ شیرِ یزداں شاہِ مرداں — درِ علم لدنی فیضِ رحماں
>
> الشہاب الثاقب: ص ۵۶

حضرت رح کی مذکور تحریر سے واضح الفاظ میں معلوم ہو گیا کہ خواہ زندہ بزرگوں کے وسیلہ کے منکر ہوں یا وفات یافتہ بزرگوں کے وسیلہ کے منکر صرف نجدی اور

وہابی ہیں ۔ ان کے سوا کسی کو وسیلہ کا انکار نہیں ہے ۔ نیز علمائے دیوبند نہ صرف انبیاء اور اولیاء کو خود وسیلہ بناتے ہیں کہ اپنے مخلصین کو اس کی ہدایت بھی کرتے رہتے ہیں ۔ یہ صرف حضرت موصوف کی رائے نہیں ہے بلکہ دارالافتاء کا فتوی بھی یہی ہے ۔

یہ بات میں نے صرف ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو دارالافتاء اور حضرت موصوف کی رائے کو علیحدہ کر کے سوچتے ہیں ۔ ورنہ حضرتؒ خود دارالافتاء ہیں ۔ آپ آپ اطمینان کے لیئے دارالافتاء کا سوال وجواب بھی پڑھ لیجئے :

سوال

فاتحہ کے بعد دعا مانگنا کہ اے خدا ان بزرگ کے طفیل سے میرا یہ کام پورا ہو یا یہ کہے کہ اے فلاں بزرگ آپ مقبول بارگاہِ خداوندی ہیں ۔ ہمارے مقاصد کے لیئے دعا فرمائیے یہ شرعاً جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

" اس طرح اور اس عنوان سے توسل بزرگوں کے ساتھ جائز ہے ۔"

فتاوی دارالعلوم دیوبند امداد المفتنین : ج ۵،۶ : ص ۲۰۰

آپ دیکھ رہے ہیں کہ دارالعلوم کے فتوی میں خود صاحب قبر سے خطاب کو بھی جائز بتلایا گیا ہے ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ جواب میں یہ بات کہاں ہے ؟ جی ضرور ہے ! اس لیئے کہ جب سائل نے پوچھا ہے کہ صاحبِ قبر

بزرگ سے یہ کہنا کہ "اے فلاں بزرگ آپ مقبولِ بارگاہِ خداوندی ہیں ہمارے مقاصد کے لیے دعا فرمائیے" شرعًا جائز ہے یا نہیں؟ اور جواب میں کہا گیا ہے کہ اس طرح اور اس عنوان سے توسل بزرگوں کے ساتھ جائز ہے کے معنیٰ اس کے سوا اور کیا ہوں گے؛

حضرت مولانا شیخ آدم رح مفتی باقیات صالحات ویلور اپنے فتاوے میں ارشاد فرماتے ہیں: (سوال محذوف)

الجواب

"مُردوں سے حاجتیں و منتیں مانگنا اگر مُردے بالاستقلال حاجت برلانے والے ہیں سمجھ کر مانگتے ہوں تو یہ شرک فی الصفات ہے ہرگز جائز نہیں، حرام اور کفر ہے۔ اگر ان سے توسل کیا مثلاً خدا سے چاہا کہ خداوندا فلاں نبی یا ولی یا بزرگ کے طفیل یا وسیلہ سے مجھے فلاں چیز دے یا فلاں مقصد برلا، خود ان بزرگوں سے خطاب کرکے اے فلاں آپ جنابِ باری میں دعا کریں کہ میرا فلاں مطلب برلاوے تو یہ منع نہیں۔"

کتبہ شیخ آدم عفی عنہٗ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد عبدالجبار عفی عنہ	عبدالرحیم عفی عنہٗ	محمد عبدالعلی عفی عنہٗ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
محمد عبدالصمد عفی عنہٗ	سید محمد سعید کان اللّٰہ لہٗ	محمد عمر عفی عنہٗ

دفتر فتاوی شیخنا: غیر مطبوعہ: ص ٢٥٠

مذکورہ فتوی میں حضرت مفتیؒ نے خدا سے خطاب کر کے انبیاء
اور اولیاء کو وسیلہ بنانا نیز خود صاحب قبر سے خطاب کر کے ان سے بارگاہ الٰہی
میں دعا کی درخواست کرنا دونوں صورتیں جائز بتائی ہیں۔

بہر حال اہل السنۃ والجماعۃ کے پاس بزرگوں کو وسیلہ بنانا جائز ہے۔ کسی نے بھی انکار نہیں کیا ہے۔ انکار کریں گے بھی کیسے! جب کہ قرآن پاک میں خود اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: یا ایھا الذین اٰمنوا اتقوا اللّٰہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ: ترجمہ: مومنو! اللہ سے ڈرو اور اس کی بارگاہ میں وسیلہ لے آؤ۔ اور بہت ساری احادیث شریفہ ہیں۔ حدیث تو آپ نے ابتداء ہی میں پڑھ لی ہے۔ حدیث اعمیٰ اندھے والی حدیث بھی ہے تفصیل میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ حضرت مولانا ارشد القادری صاحب کی کتاب "شریعت" جو انہوں نے جناب پالن حقانی صاحب کی کتاب "شریعت یا جہالت" کے جواب میں لکھی ہے اور پالن حقانی صاحب نے وسیلہ کے خلاف جو بحث کی ہے اس کا مختصر اور دل نشین جواب دیا ہے۔ اس کو یہاں قارئین کرام کے فائدے کے لیئے نقل کر رہا ہوں۔

وسیلہ کی بحث

حقانی صاحب نے اپنی کتاب میں وسیلہ کے خلاف جو بحث کی ہے میں اسے ایسی جھوٹی گواہی سے تشبیہ دوں گا جو جرح کے وقت جگہ جگہ سے ٹوٹ جائے۔ اب یہ تاریخی بحث آپ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ:

"حنفی مذہب میں وسیلہ سے دعا مانگنا جائز ہے۔" (ص ۲۹۸)

اب ان کا دوسرا بیان ملاحظہ فرمائیے: لکھتے ہیں:

"کسی مزار پر جاکر یا اپنے گھر ہی میں سے ان کے حق میں بعد میں فاتحہ اور دعائے مسنون کے خانۂ کعبہ یا دیگر مقامات مقدسہ یا تلاوتِ قرآن کی برکت سے یا فلاں زندہ بزرگ کے اعمال صالحہ کی برکت سے میرا فلاں کام پورا کردے" تو جائز ہے"

ص ٣٠٠

اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں پہلی بات تو یہ کہ وسیلہ اگر جائز ہے تو صرف زندہ بزرگ کا وفات یافتہ بزرگ کا نہیں۔ اور وہ بھی ان کے نیک اعمال کا، ان کی ذات کا نہیں۔ اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی دعا مانگنے کی جگہ مزارات بھی ہیں اب اُن کا تیسرا بیان بھی پڑھیے۔ "عین الھدایہ" اور "فتاویٰ عالم گیری" کے حوالے سے انھوں نے تحریر فرمایا ہے:

"انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کے (عملِ صالح) کے وسیلہ سے دعا کرنا مضائقہ نہیں"

ص ٢٠٠

اس بیان میں انبیاء علیہم السلام کے عملِ صالح کے وسیلہ سے دعا مانگنے کی اجازت دی گئی ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ وفات یافتہ بزرگوں کے نیک اعمال کے وسیلہ سے بھی دعا مانگی جا سکتی ہے۔ کیوں کہ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنی حیاتِ ظاہری کے ساتھ آج

اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ ہزاروں سال پہلے وصال فرما چکے ہیں۔ اس عبارت میں بھی بریکیٹ کے اندر انھوں نے اپنی طرف سے (عملِ صالح) کا لفظ بڑھا کر اس بات کو واضح کردیا ہے کہ انبیاء و اولیاء کی ذات کا وسیلہ جائز نہیں ہے صرف نیک اعمال کا وسیلہ دے سکتے ہیں۔! لیکن اسی بحث میں انہوں نے ایک حدیث نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

> "رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و پریشان حال مسلمانوں کا واسطہ دے کر خدا سے کفار پر فتح کی دعا مانگی تھی"۔
>
> ص ۳۰۰

اس حدیث سے حقانی صاحب کا یہ بیان بالکل جھوٹا اور غلط ثابت کہ ذات کا وسیلہ جائز نہیں صرف اعمال کا وسیلہ دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ یہاں لفظ ہے "مسلمانوں کا واسطہ دے کر"، جس کے معنے یہ ہیں کہ حضورؐ نے ذات کے وسیلہ سے دعا مانگی تھی، اعمال کا کہیں ذکر نہیں۔

اب ایک تماشہ اور ملاحظہ فرمائیے:

اس حدیث کے مطابق جب حضورؐ نے صحابہؓ کا واسطہ دے کر خدا سے دعا مانگی تو حضورؐ کے اس عمل سے واضح طور پر ثابت ہوگیا کہ وسیلہ کے ساتھ دعا مانگنا سنّتِ رسول ہے۔ اب ایک طرف یہ حدیث نظر میں رکھیئے اور دوسری طرف حقانی صاحب کا یہ بیان پڑھیئے۔ شریعت کی جھوٹی حمایت کا جذبہ بے نقاب ہوجائے گا۔ تحریر فرماتے ہیں۔

"دُعا کے وقت کسی قسم کا واسطہ اور وسیلہ کا شرع شریف میں حکم نہیں ہے اور نہ خدا کو اس کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ ہر وقت سُنتا ہے" ص ۳۰۶

اور کتنے منکم کہیں گے؟ جب حدیث سے ثابت ہو گیا کہ نیک بندوں کا وسیلہ اور واسطہ دے کر دعا مانگنا سنّتِ رسولِ اکرمؐ ہے تو اس کے متعلق شرعِ شریف کا اور کون سا نیا حکم آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں؟ کیا شرع شریف نے سنّتِ رسولؐ پر عمل کرنے کا مطالبہ مسلمانوں سے نہیں کیا ہے؟ کیا اسلام کا یہ بنیادی مسئلہ بھی آپ کو بتانا پڑے گا! اور عبارت کا یہ فقرہ کہ "نہ خدا کو اس کی ضرورت ہے؟" بڑے غضب کا ہے؟ آج بالکل پہلی بار اس نکتہ سے ہم روشناس ہوئے کہ معاذ اللہ خدا کو بھی ضرورت پیش آتی ہے؟ وسیلہ کی چوں کہ اُسے ضرورت نہیں ہے اس لئے یہ کام عبث اور فضول ہے اور نماز روزہ کی اسے ضرورت ہے اس لئے وہ ضروری ہے اور وجہ بھی کتنی معقول بتائی گئی ہے۔ چوں کہ وہ ہر وقت سُنتا ہے اس لیے وسیلہ کی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پھر سرے سے دعا ہی کی ضرورت کیا ہے؟ جب کہ بندوں کا حال بھی اس سے مخفی نہیں ہے، وہ ہر وقت دیکھتا ہے اور جانتا ہے جو بہتر ہو گا وہ خود کرے گا۔ کسی کے کہنے اور سُننے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

پھر زبان درازی کرنے سے پہلے حقانی صاحب کو کم از کم اتنا سوچنا چاہئے تھا کہ نیک بندوں کا واسطہ دے کر جب رسول پاکؐ نے دعا مانگی ہے تو

ان سے بڑھ کر وسیلے کی اہمیت اور ضرورت سے کون واقف ہوگا؟ اب اس کا فیصلہ میں آپ ہی کے جذبۂ انصاف پر چھوڑتا ہوں کہ اپنی اس تحریر میں وسیلے پر جو انھوں نے چوٹ کی ہے اس کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے؟ بحث کے خاتمہ پر حقانی صاحب سے دو سوال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ اس کا صحیح جواب دیں گے

پہلا سوال تو یہ ہے کہ آپ نے مزارات پر جا کر دعا مانگنے کے بارے میں جو لکھا ہے کہ یہ جائز ہے تو یہ بات آپ نے کہاں سے لکھی ہے؟ اور کیوں لکھی ہے جب خود نبی یا ولی کی ذات آپ کے نزدیک دعا کی مقبولیت کا ذریعہ نہیں بن سکتی تو ان مزارات میں کیا خصوصیت ہے؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک طرف تو آپ نے اپنی اسی کتاب میں بتوں کے حق میں نازل ہونے والی تمام آیتوں کو انبیاء اور اولیاء کے مزارات پر منطبق کیا ہے اور دوسری طرف برکتوں کے حصول کے لیے ان ہی مزارات پر جانے کی آپ مسلمانوں کو ترغیب بھی دیتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی کون سی بات صحیح ہے؟

خدا کا شکر ہے کہ بوسیلۂ سرکار محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم وسیلے کے خلاف حقانی صاحب کی ساری بحث کا بخیہ ادھڑ گیا اب ان کے اندر ذرا بھی غیرت ہوگی تو مسلمانوں کے سامنے وسیلہ کے خلاف لب کشائی نہیں کریں گے۔

"شریعت" از علامہ ارشد القادری ص ۶۵-۶۹

اخیر میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند کے ایک مکتوب کا یہ اقتباس پڑھ لیں۔ شرح صدر ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے

کہ دُعا میں بحقِ فلاں یا بحرمۃ فلاں کہنا نہ صرف جائز ہے بلکہ مستحسن ہے۔ مودودی صاحب منع کرتے ہیں غلطی پر ہیں۔ اور "ہدایہ" کی عبارت سے اس کا استدلال صحیح نہیں ہے۔ 'ھدایہ' میں حق بمعنی واجب عقلی کو منع کیا گیا ہے اور اہلِ سنّت جب دُعا میں یہ کلمہ کہتے ہیں تو واجبِ عقلی مراد نہیں بلکہ ایسے معانی لیتے ہیں جن سے توسل سمجھا جاتا ہو جو کہ ارجی للاجابت ہے۔ واللہ اعلم

(مکتوبات شیخ الاسلام: ج ۴: ص ۱۳۷۔

○

استعانت و استمداد

استعانت کے معنی ہیں مدد چاہنا۔ اس سے مقصود تمام مہمات میں نیز عبادت میں بھی اللہ تعالیٰ سے مدد چاہنا۔ اس لیئے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اُن کی مدد شامِل حال نہ ہو ہم سے عبادت بھی ہونے کی نہیں۔ اور اسی لیئے اس آیتِ شریفہ **وایاك نستعین** (ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں) میں ہم کو خدا ہی سے مدد چاہنے اور آپ ہی کی ذات پر بھروسہ کرنے اور غیر اللہ سے صرفِ نظر کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس مقام پر ہمارے ذہنوں میں اس سوال کا اُبھرنا ناگزیر ہے۔ کہ ہم ضروریاتِ زندگی میں چھوٹی موٹی چیزوں تک اپنے پڑوسیوں سے مانگ لیتے ہیں۔ مدرسوں، مسجدوں اور یتیم خانوں کے لیے سرمایہ داروں سے چندہ بھی مانگتے ہیں، نیز ہم نے بڑے بزرگوں اور علمائے کرام سے متعلق سُنا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے کہ وہ اولیاء اللہ کی قبروں پر مراقبہ کر کے اُن سے استعانت و استمداد کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ ساری صورتیں ایاك نستعین سے حرام اور ناجائز ہونا چاہیئے۔ جواب یہ ہے کہ استعانت درحقیقت دو قسم پر ہے۔ پہلی قسم یہ ہے کہ مستعین (مدد مانگنے والا) مستعان (جس سے مدد مانگی جائے) کو حلِ مشکلات میں مستقلاً موثر حقیقی یا اس کو کارخانۂ قدرت میں شریک و دخیل

سمجھ کر مدد مانگے یہ بلا شبہ شرک ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ مستعین مستعان کو مستقلاً حلِ مشکلات میں مؤثرِ حقیقی یا کارخانۂ قدرت میں اس کو دخیل نہ سمجھے صرف ان کو واسطہ جانے کہ خاصانِ خدا ہیں مستجاب الدعوات ہیں ان کی دُعا بارگاہِ الٰہی میں قبول ہونے کی پوری توقع ہے۔ یہ دوسری قسم بلاشک وشبہ جائز ہے۔ ہمارے اس دعوے کے ثبوت میں علمائے کرام اور مفتیانِ دین کے فتاوی ملاحظہ فرمائیے:

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ فاضلِ دیوبند" مقالات احسانی" کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

> "امداد حاصل کرنے کے لیئے ملکوتی ارواح ہوں یا انسانی ارواح ہر ایک کی عبادت شرک ہے۔ ایسا گناہ جو کبھی بخشا نہ جائے گا لیکن خدا جیسے بندوں کی مدد آفتاب کی روشنی، ہوا، پانی وغیرہ مخلوقات سے کراتا ہے اگر فرشتوں یا بزرگوں کی روحوں سے بھی اپنے بندوں کی مدد کرے تو اس کو شرک سمجھنا غباوت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔
>
> مقالاتِ احسانی: ص ۴۷

در حقیقت فعل کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہوتی ہے اور بندے کی طرف بھی۔ اللہ کی طرف جو نسبت ہے وہ حقیقت ہے اور بندے کی طرف جو نسبت ہے وہ مجاز۔ جیسے آپ کہتے ہیں ندی بہتی ہے، ندی نہیں بہتی پانی بہتا

ہے۔ بہنے کی نسبت ندی کی طرف مجاز اور پانی کی طرف حقیقت ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں آگ جلاتی ہے یا پانی پیاس بجھاتا ہے، درحقیقت نہ آگ جلا سکتی ہے نہ پانی پیاس بجھا سکتا ہے اگر خدا نہ چاہے۔ کسی فعل کی نسبت بزرگوں اور اولیاء اللہ کی طرف کرنے کو بھی اسی پر قیاس کر لیجئے۔

حضرت مولانا عبدالعزیز دہلویؒ نے "فتح العزیز" میں سورہ فاتحہ کی تفسیر کے ضمن میں ارشاد فرمایا ہے:

"دریں جا باید فہمید کہ استعانت از غیر بوجہیکہ اعتماد برآں غیر باشد و او را مظہر عون الٰہی نداند حرام است و اگر التفات محض بجانب حق است و او را یکی از مظاہر عون دانستہ و نظر بکارخانہ اسباب و حکمت او تعالیٰ درآں نمودہ بغیر استعانت ظاہری نماید دور از عرفان نخواہد بود و در شرع نیز جائز است وانبیاء و اولیاء ایں نوع استعانت بغیر کردہ اند درحقیقت ایں نوع استعانت بغیر نیست بلکہ استعانت بحضرت حق است لا غیرہ انتہی: —— تحقیق الحق المبین: ص ۲۶

ترجمہ: اس مقام پر یہ بات سمجھنا چاہیئے کہ غیر سے اس طریقے پر مدد چاہنا کہ بھروسہ اس غیر ہی پر ہو۔ اور اس کو مظہرِ عون الٰہی نہ جانے حرام ہے۔ اگر توجہ محض اللہ کی طرف ہو اور اس کو مظہر عون میں سے ایک مظہر جان کر اور اس میں خدا کے کارخانے اسباب و حکمت پر نظر کر کے غیر اللہ سے ظاہراً استعانت کریں تو عرفان سے دور نہیں ہوگا اور شریعت میں بھی جائز ہے اور انبیاء اور اولیاء

بھی اس قسم کی استعانت غیر سے کے ہیں۔ درحقیقت استعانت کی یہ قسم استعانت بغیر نہیں ہے بلکہ خدا کی ذات سے ہی استعانت ہے غیر سے نہیں۔

اور حضرت مولانا احمد رضا خان صاحبؒ فرماتے ہیں:۔

> "حجۃ الاسلام امام غزالیؒ گفتہ ہر کہ استمداد کردہ می شود بوے در حیات استمداد کردہ می شود بوے بعد از وفات۔"
>
> فتاوی رضویہ: ج ۴: ص ۲۹۱
>
> ترجمہ: حجۃ الاسلام امام غزالیؒ نے فرمایا ہے کہ جس شخصیت سے ان کی زندگی میں مدد طلب کی جائے گی ان سے ان کے وفات کے بعد بھی مدد طلب کی جائے گی۔

بعض نادان بھائی بے سوچے سمجھے کہتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء وغیرہ سے ان کی زندگی میں مدد طلب کرنا جائز ہے، بعد وفات جائز نہیں شرک ہے۔ عجیب شرک ہے کہ زندگی میں تو شرک نہیں وفات کے بعد شرک بن جاتا ہے۔

حضرت امام شافعیؒ جیسی عظیم شخصیت نے ارشاد فرمایا ہے: کہ حضرت امام موسیٰ کاظمؒ کی قبر دعا قبول ہونے میں تریاق مجرّب ہے۔

مطلب یہی تو ہوا کہ اس ذات مقدّس کو اللہ کی بارگاہ میں وسیلہ بنانا اور ان سے استعانت کرنا تریاق مجرب ہے۔

اولیاء اللہ سے مدد مانگنے سے متعلق "انکشاف" میں ہے کہ یہ شرک نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

"وہاں شرک جب ہو تا کہ اولیائے کرام کو متصرفِ حقیقی سمجھتے ہوئے یہ عقیدہ رکھے کہ ہر کام اور ہر قسم کے تصرف کا حق اُن کو ہے۔" "انکشاف صا۱۰۱۔ زلزلہ صا۱۳۵"

"انکشاف" وہی کتاب ہے جس کے آغاز میں مفتیانِ دیوبند حضرت مولانا مفتی احمد علی سعید اور حضرت مولانا مفتی ظفیر احمد صاحب نے تقریظ لکھ کر اس کی تصدیق کی ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی سے ایک صاحب نے سوال کیا تھا، آپ نے اس کا جواب دیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

السوال

اذا تحیرتم فی الامور فاستعینوا باصحاب القبور حدیث است یا نہ۔ و معنی آن چیست؟

الجواب

"حدیث نیست قول کسے است و معنی آن این ست کہ کہ وقتیکہ متحیر شوید در حل و حرمت بعض اشیار بنظرِ دلائل متعارضہ پس اجتہاد خود را ترک نمودہ تقلیدِ اصحابِ قبور یعنی قدمائے کہ در قبر می خسپند باید کرد و میتوان کہ معنی آن چنین باشد وقتیکہ در امور دنیویہ دل تنگ شوید پس نظر کنید بطرف اصحاب قبور کہ دنیا را ترک کردہ سفر آخرت کردند روزی باشد کہ شما را ہم سفر کردن است

و دنیا را گذاشتنی و نیز بر استمداد ہم محمول میتواں شد یعنی وقتیکہ متحیر شوید در امور و کار برآری شما نشود پس دعائے انجاح مرام بوسیلۂ اصحاب قبور سازید و ایشان را وسیلہ گردانید نہ جناب باری دعا سازید تا ببرکت ایشان بدرجۂ قبول رسد نہ اینکہ ایشان حلِ مشکلات استقلالا یا شریک کارخانۂ تدبیر عالم دانید کہ ایں شرک است۔" مجموعۂ فتاوی: ج ۳ : ص ۲۱۔

ترجمہ سوال: ۔ جب تم دنیوی یا اخروی امور میں دل تنگ ہوجاؤ تو اصحابِ قبور سے فتوی طلب کرو، حدیث ہے یا نہیں؟ اور اس کا معنی کیا ہے؟

ترجمہ جواب: کسی کا قول ہے حدیث نہیں ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے۔ دلائلِ متعارضہ کی وجہ سے بعض اشیاء کے حلال یا حرام ہونے کا فیصلہ کرنے میں حیران ہوجاؤ تو اپنے اجتہاد کو ترک کرکے ان اصحابِ قبور کی یعنی قدماء کی تقلید کرنی چاہیے جو اپنی قبروں میں سو رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی ایسے بھی ہو جس وقت تم دنیوی امور میں دل تنگ ہوجاؤ تو مرے ہوئے لوگوں کا تصوّر کرو جو دنیا ترک کرکے آخرت کا سفر اختیار کرچکے ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تم کو بھی سفر کرنا اور دنیا کو چھوڑنا ہے۔ اور اس قول کو انبیاء اور اولیاء سے استمداد پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے۔ یعنی جس وقت تم اپنے معاملات میں متحیر ہوجاؤ اور تمہاری کار برآری نہ ہوتی ہو تو مقصد پورا ہونے کے لیے اصحابِ قبور کے

وسیلہ سے دعا کرو اور انھیں وسیلہ بنا کر جناب باری سے دُعا کرو تاکہ ان بزرگوں کی برکت سے دُعا قبولیت کے درجہ کو پہنچ جائے یہ نہیں کہ انھیں مستقلاً مشکلات کو حل کرنے والے یا کارخانۂ تدبیر عالم میں خدا کے شریک سمجھ بیٹھو اس لیئے کہ ایسا سمجھنا شرک ہے۔

مجموعۂ فتاوی: ج ۳ : ص ۲۱

ان لوگوں کے لیئے جو بزرگ علماء کے معتقد ہوں، حقیقت جاننا اور اس پر عمل کرنا چاہتے ہوں اور مسلمانوں میں اختلاف کے بیج بونا نہیں چاہتے ہوں مذکور فتاوی اور ھدایات کافی سے زاید ہیں لیکن ہمیں بعض حضرات کو بات بات پر کفر و شرک کی گردان کرتے ہوئے سُن کر حیرت کے ساتھ شبہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں ان لوگوں نے "اِکھنا راسینڈ کو" ہی کھول نہ لی ہو۔ ورنہ کیا بات ہے کہ ہمارے یہ بھائی بڑے بڑے علم کے پہاڑ اور متقی و پرہیزگار علماء کے فتوؤں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ اللہ تعالی ہمیں ہر طرح کے شر سے محفوظ رکھے۔

ندا لغیر اللہ

اس میں شک نہیں ہے کہ غیر اللہ کو الوہیت کے درجہ میں رکھ کر پکارنا یا مدعو سے متعلق یہ یقین رکھ کر کہ وہ حاضر و ناظر ہے پکارنا حرام ہے۔ (اگرچہ کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ آں حضرت صلعم بحکم خدا حاضر و ناظر ہیں[۱] جیسے کراماً کاتبین) اس لیے کہ علم غیب ذاتی اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے۔ اگر پکارنے والا ایسا اعتقاد نہ رکھے تو ندا بلا شک و شبہ جائز ہے۔ جس میں کسی بھی عالم کو خلاف نہیں ہے۔ اب آپ اس ضمن میں لکھے جانے والے مندرجہ ذیل احادیث و آثار اور مفتیانِ عظام کے فتاویٰ کا امعان نظر سے مطالعہ کیجئے اور فیصلہ کیجئے کہ کیا ندا لغیر اللہ کا مسئلہ اس کے سوا اور کچھ ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر کیا یہ دین داری اور عقل مندی کی بات ہے کہ ہم ہر پکارنے والے کو مرتکب حرام ٹھہرائیں اور اچھے خاصے مسلمان کو زبردستی مشرکین کے زمرہ میں داخل کر کے اپنی عاقبت بگاڑ لیں؟ اور اپنی ذاتی اغراض کے لئے مسلمانوں میں ایک ختم نہ ہونے والی نفرت کا بیج بو دیں اور بوتے ہی چلے جائیں؟

اس تمہید کے بعد آپ سب سے پہلے حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح،

---

[۱] انوارِ آفتابِ صداقت ص ۲۰۵

شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند کا فیصلہ کن بیان پڑھ لیں : لکھتے ہیں :۔

"علی ھذا القیاس مسئلہ ندائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں وہابیہ مطلقاً منع کرتے ہیں اور یہ حضرات (اکابر دیوبند) نہایت تفصیل فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لفظ یا رسول اللہ علیہ السلام اگر بلحاظ معنی اسی طرح نکلا ہے جیسے لوگ بوقت مصیبت و تکلیف ماں اور باپ کو پکارتے ہیں تو بلاشبہ جائز ہے۔ علی ھذا القیاس اگر بلحاظ معنی درود شریف کے ضمن میں کہا جاوے گا تو بھی جائز ہوگا علی ھذا القیاس اگر کسی سے غلبۂ محبت و شدّتِ وجد و توفرِ عشق میں نکلا ہے تب بھی جائز ہے اور اگر اس عقیدہ سے کہا ہے کہ اللہ تعالٰی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اپنے فضل و کرم سے ہماری ندا کو پہنچا دے گا، اگرچہ ہر وقت پہنچا دینا ضروری نہ ہوگا، مگر اس امید پر وہ ان الفاظ کو استعمال کرتا ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں علی ھذا القیاس اصحاب ارواح طاہرہ و نفوس ذکیہ جن کو بعد مکانی اور کثافتِ جسمانی اپنے عرائض کی تبلیغ میں مانع نہ ہوں اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔ مگر ہر دو طریقۂ اخیرہ میں عوام کے سامنے نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اپنی کم فہمی کے باعث سے حضور اکرم علیہ السلام کی نسبت یہ عقیدہ ٹھہرا لیتے ہیں کہ جیسے جناب باری عزّ اسمہ پر جملہ اشیاء ظاہریہ و باطنیہ مخفی نہیں اور ہر جگہ کے جملہ امور اس کے نزدیک حاضر و معلوم و مسموع ہیں اسی طرح رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

کو بھی تمام اشیاء معلوم ہیں اور آں جناب صلعم کو عالم الغیب خیال کرنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ عالم الغیب والشہادت ہونا صفاتِ مخصوصہ جنابِ باری عزّ اسمہٗ سے ہے اور اسی طرح ندا کرنا حضور علیہ السلام کو یعنی بایں اعتقاد کہ آپ صلعم ہر منادی کی ندا کی خبر ہو جاتی ہے ناجائز ہے۔ وہابیہ خبیثہ یہ صورت نہیں نکالتے اور جملہ انواع کو منع کرتے ہیں۔"

الشہاب الثاقب: ص ۶۴

میں نے تمہید میں عرض کیا تھا کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ "آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحکمِ خدا حاضر و ناظر ہیں جیسے کراماً کاتبین" اس کو ذہن میں رکھ کے شیخ الحدیث رح کی مذکورہ عبارت یعنی اصحابِ ارواحِ طاہرہ و نفوسِ ذکیہ جن کو بعدِ مکانی اور کثافتِ جسمانی اپنے عرائض کی تبلیغ میں مانع نہ ہوں اس میں بھی کوئی قباحت نہیں یعنی ایسے لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار سے اپنے مقام پہ بیٹھے بیٹھے مشرف ہو کر بالراس خطاب کرتے ہیں۔ اس میں بھی کوئی قباحت نہیں۔

اس مقام پہ آپ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا بیان بھی پڑھ لیں جو بالراست زیارتِ نبوی صلعم کی تائید کرتا ہے:- فرماتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کبھی عینی بھی ہو سکتی ہے وہ اس طرح کہ یہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ مبارک تک حجابات اٹھ جائیں اور اصل صورت نظر آ جائے۔"

(افاضات الیومیہ: حصہ ہفتم: ص ۱۹۶)

ایسے میں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عینی زیارت کرنے والے شخص کے ندا کرنے میں کسی بھی مفتی کو شک و شبہ نہیں ہے۔ وہ بلا کھٹکے یا رسول اللہ کہہ سکتا ہے

اور آگے بڑھئے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ بیان بھی پڑھ لیجئے جو "افاضات الیومیہ" میں درج ہے :

> "ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا (تھانویؒ) کہ اس امّت میں ایسے ایسے اہلِ اللہ گزرے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ان کو ہر وقت مشاہدہ رہتا تھا۔" افاضات الیومیہ: ص ۱۱۵

ظاہر ہے کہ ایسے اہل اللہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر وقت یارسول سے خطاب کر سکتے ہیں۔ اس مقام پہ پہنچ کر احقر کا ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ جب اہل اللہ کا یہ عالم ہو کہ انھیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر وقت مشاہدہ رہتا تھا تو پھر سید الانبیار سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کا کیا عالم ہو گا ؟ احقر کو یقین ہے کہ علمائے کرام کو مفتیان عظام کو عوام کو گمراہی کا خوف ہے۔ لہذا حقیقت سے گریز ہے۔

چناں چہ جب حضرت مولانا تھانویؒ سے پوچھا گیا "یارسول اللہ" کہنا جائز ہے یا نہیں ؟ تو فرمایا

> "عوام کو منع کرنا چاہیئے۔" فتاوی امدادیہ ج ۴: ص ۱۱۵

یعنی خواص کے لیے بلا کھٹکے جائز ہے۔ اس فتوی کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی کتاب فتاوی رشیدیہ کا یہ سوال وجواب بھی پڑھ

پڑھ لیں ۔

سوال

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو شخص بغیر حاضر و ناظر جانے پکارے مثلاً اس قسم کے اشعار پڑھے ؎

ترحم یا نبی اللہ ترحم　　ز مہجوری برآمد جان عالم

جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

"ایسے اشعار میں شرک تو نہیں ہے مگر عوام کو موجب اضلال کا ہوتا ہے لہذا کسی کے روبرو نہ پڑھے اور بایں خیال پڑھے کہ حق تعالیٰ اس میری عرض کو پیش فخر عالم ؐ کے کر دیوے ۔"

فتاوی رشیدیہ : حصّہ اول : ص ٦٦

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح نے اپنے فتوی میں فرمایا : عوام کو منع کرنا چاہیے ۔ مطلب یہ کہ خواص یارسول اللہ پکار سکتے ہیں ۔ شاید حضرت نے اس خیال سے ایسا فرمایا ہے کہ عوام الناس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ذاتِ خداوندی کی طرح حاضر و ناظر سمجھ کر پکارتے ہیں اور خواص بات ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتے ہیں ۔ دوسرے علمائے کرام کہتے ہیں کہ اگر عوام بھی علمائے کرام کی ہدایتوں پر عمل کرتے ہوں اور ان کی نگرانی میں یارسول اللہ کہیں تو کوئی حرج نہیں اور اس کے مستحب ہونے میں شک بھی نہیں ہے ۔ 4

چناں چہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح فرماتے ہیں :

"چناں چہ وہابیہ عرب کی زبان سے بارہا سنا گیا ہے کہ الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ کو سخت منع کرتے ہیں۔ اور اہلِ حرمین پر سخت نفرین۔ حالاں کہ ہمارے مقدس بزرگان (علمائے دیوبند) اس صورت اور جملہ صورت درود شریف کو اگرچہ بہ صیغۂ خطاب ونداکیوں نہ ہو مستحب و مستحسن جانتے ہیں۔"

الشہاب الثاقب: ص ۶۵

۴

عام طور پر بھی اور خصوصًا درود شریف کے ساتھ بھی اموات سے خواہ نبی ہوں یا ولی خطاب کرنا وہابیوں اور نجدیوں کے پاس شرک ہے اور یارسول اللہ پکارنے والا مشرک، نعوذ باللہ من ذالک۔ اس پر شیخ العلماء مکہ حضرت عمر عبدالرسول نے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا تو سعود نے پوچھا تو شیخ العلماء نے فرمایا یہ عجب شرک ہے کہ ہر نماز میں موجود الصلوٰۃ والسلام علیک یا ایھا النبی اگر یہ عقیدہ مسلم ہو تو سب صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین اور جمیع افراد امت شرک سے نجات نہیں پائیں گے۔

حضرت غزالیؒ "احیاء العلوم" میں نماز کے بیان میں لکھتے ہیں: احضر فی قلبک النبیؐ و شخصہ الکریم وقل السلام علیک ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ یعنی تشہد میں اپنے دل میں نبی اکرمؐ اور آپؐ کے جسدِ مقدس کو حاضر کر کے السلام علیک یا ایھا النبی و رحمۃ اللہ و برکاتہ پڑھو۔

ایک صاحب نے "تجلی" کے ایمان نمبر جولائی ۷۲ء سنہ میں مدیر تجلی عامر عثمانی فاضلِ دیوبند کی ایک عبارت جو ڈاک نمبر میں چھپی ہے پیش کر کے اس پر سوال کیا ہے کہ

"کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح مخاطب کرنا درست ہو سکتا ہے؟ اگر واقعی درست ہے تو پھر بریلوی مکتبۂ فکر کا مخصوص نعرہ "یا رسول اللہ" آخر کس طرح ناجائز ہوگا جس کی تردید و تغلیظ میں آپ نے تجلّی کے دفتر کے دفتر اب تک سیاہ کر دئے ہیں! مدیر تجلّی کی عبارت یہ ہے:

> " اور اے شفیع المذنبین، اے اللہ کے آخری رسولؐ، اے وہ کہ جس پر انسانیت کا کمال ختم ہے، تیرے سامنے بھی کیا منہ لے کر آئیں گے کہ تیری دی ہوئی تعلیم و تربیت کو ہم نے لوحِ عمل سے کبھی کا کھرچ دیا ہے۔"

مولانا عامر عثمانی نے اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے کہ

> " یارسول اللہ وغیرہ کہنا بجائے خود کوئی کار گناہ نہیں ایک مباح فعل ہے اسے شرک کہیں گے جب اس کے پیچھے غلط عقائد موجود ہوں گے۔ اور اسی کو بالکل جائز قرار دیں گے جب واضح قرینہ یہ بتا رہا ہو غلط عقائد کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔"
>
> (تجلّی: دیوبند، جولائی اگست ۱۹۷۳ء: ص ۵۸)

باطل عقیدہ کیا ہے خود مولانا عامر عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ دل و دماغ میں یہ بات ہو کہ " یہ غائب حضرات ہماری پکار سنتے ہیں اور ہماری دستگیری

کرتے ہیں۔

اس بحث کو جانے دیجیئے کہ یہ "سائنس کا زمانہ ہے۔ مشرق میں کی جانے والی تقریریں مغرب میں سن لی جاتی ہیں اور راکٹ کے ذریعہ جن افراد کو خلاؤں میں بھیجا گیا تھا ان کی دل کی دھڑکنیں تک ہزاروں میل کی دوری سے زمین پر ریکارڈ کرلی جاتی ہیں۔ ابھی عراق اور امریکہ کی لڑائی میں سعودی عرب سے صدر صدام حسین کی آواز کو ریکارڈ کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ ہم یا رسول اللہ، یا سید عبد القادر جیلانی رح پکارنے والوں کے دلوں کی حالت پر فتوی جاری کرکے ان بیچاروں کو مشرک ٹھہرانے کا نیک فریضہ انجام دیں آخر ان مسلمانوں کے ساتھ نیک گمان کیوں نہ رکھا جائے۔

اب آپ حضرت مولانا حکیم زین العابدین مائل ویلوری رح استاد حضرت مولانا عبد الوہاب رح بانی باقیات صالحات ویلور کا فتوی ملاحظہ فرمائیں۔

" ندا طرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور طرف دوسرے انبیاء اور اولیاء کے جائز ہے اور اس میں کچھ خلل نہیں۔ لیکن یہ اعتقاد کرکے ندا کرنا کہ ہم جس وقت ان کو پکاریں انہوں اس وقت سنتے ہیں البتہ ممنوع ہے۔ اگر یہ اعتقاد کرے کہ ہماری ندا پر انہوں مطلع ہوتے ہیں خواہ یہ اطلاع ان کو اسی وقت ہوئے یا نہ ہوئے خواہ بالذات مطلع ہوئیں یا بالواسطہ جائز و روا ہے۔"

مراۃ الحق: تاریخ تصنیف سنہ ۱۲۶۱ھ

مذکور فتوی سے معلوم ہوا کہ ایک صورت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بالذات مطلع ہونے کی بھی ہے۔ خواہ آپ کہیں سے بھی پکاریں۔ اس کے متعلق حضرت مولانا گنگوہی کا دوسرا تفصیلی فتوی بھی پڑھ لیں۔

سوالِ ہفتم

پڑھنا ان اشعار و قصائد کا خواہ عربی ہوں یا غیر عربی جن میں مضمونِ استغاثہ بغیر اللہ تعالیٰ ہوں، کیسا ہے؟

الجواب

"یہ خود معلوم آپ کو ہے کہ ندا غیر اللہ تعالیٰ کو کرنا دُور دُور سے شرک حقیقی جب ہوتا ہے کہ ان کو عالم سامع مستقل عقیدہ کرے ورنہ شرک نہیں۔ مثلاً یہ جانے کہ حق تعالیٰ ان کو مطلع فرمادیگا یا باذنہ تعالیٰ انکشاف ان کو ہو جاوے گا یا باذنہ تعالیٰ ملائکہ پہنچا دیں گے جیسا درود کی نسبت وارد ہے۔ یا محض شوقیہ کہتا ہو محبت میں یا عرض حال محل تحسر و حرماں میں کہ ایسے مواقع میں اگرچہ کلمات خطابیہ بولتے ہیں لیکن ہرگز نہ مقصود اسماع ہوتا ہے نہ عقیدہ پس ان ہی اقسام سے کلمات مناجات و اشعار بزرگان کے ہوتے ہیں کہ فی حد ذاتہ نہ شرک نہ معصیت مگر ہاں بوجہ موہوم ہونے کے ان کلمات کا مجامع میں کہنا مکروہ ہے کہ عوام کو ضرر ہے اور فی حد ذاتہ ایہام بھی ہے۔ لہذا نہ ایسے اشعار کا پڑھنا منع ہے اور نہ اس کے مؤلف پر طعن ہو سکتا ہے اور کراہتِ موہوم ہونے کی بوجہ غلبہ محبت کے منجر ہو جاتی ہے۔ مگر ایسی طرح پڑھنا پڑھانا کہ اندیشہ عوام کا ہو بندہ پسند نہیں کرتا گو اس

محمد علی عفی عنہ

کو معصیت بھی نہیں کہہ سکتا مگر خلاف مصلحت وقت کے جانتا ہے۔ مگر ہاں جس کلام میں صاف کلماتِ کفر ہوں اس کو نہ سننا حلال ہے نہ سکوت روا۔ اگر قادر نہ ہو تو الگ ہو جاوے اور جو عالم باوجود قدرت کے اس کو رد نہ کرے یہ مداہنت ہووے گی"

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

فتاویٰ رشیدیہ: حصّہ سوم: ص ۱۵

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مولانا تھانوی، مولانا حضرت قاسم نانوتوی بانیٔ مدرسۂ دیوبند اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ کے پیر و مرشد ہیں "ضیاء القلوب" کے صفحہ ۸۲ پر لکھتے ہیں کہ

"جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارتِ مبارکہ کا شوق ہو وہ عشاء کی نماز کے بعد پاک و صاف کپڑے پہن کر خوش بو لگائے اور ادب سے مدینۂ منورہ کی طرف منہ کر کے بیٹھے اور بارگاہ الٰہی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال مبارک کی زیارت کی التجا کرے اور دل کو تمام خیالات و وساوس سے خالی کر کے یہ تصوّر کرے کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم بہت سفید کپڑے پہنے ہوئے اور سبز عمامہ باندھے کرسی پر چودھویں کے چاند کی طرح جلوہ افروز ہیں۔ اور دائیں طرف الصلوٰۃ والسلام علیک یا رسول اللہ اور بائیں طرف الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ اور دل پر الصلوٰۃ والسلام علیک یا حبیب اللہ

کی ضربیں لگائے اور جس قدر ہو سکے اس درود شریف کو پے در پے پڑھے انشاء اللہ تعالیٰ حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی زیارت سے مشرف ہوگا۔
ضیاء القلوب: ص ۸۳

سوچئے اچھی طرح سوچئے اگر یا رسول اللہ یا حبیب کہنا شرک ہوتا جیسا کہ وہابی کہتے ہیں تو حضرت مہاجر مکی دائیں، بائیں اور دل پر اس کی مسلسل ضربیں لگانے کی تعلیم دیتے ہرگز نہیں۔ چلتے چلتے حضرت مولانا تھانوی کا یہ بیان بھی پڑھ لیں۔

"فرمایا کہ یوں جی چاہتا ہے کہ آج درود شریف زیادہ پڑھوں وہ بھی ان الفاظ سے الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ
شکر النعمۃ بذکر الرحمۃ: ص ۱۸

نیز حضرت مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم لکھتے ہیں:

"بندہ کے خیال میں اگر ہر جگہ درود و سلام کو جمع کیا جائے تو زیادہ بہتر یعنی بجائے السلام علیک یا رسول اللہ، السلام علیک یا نبی اللہ وغیرہ کے الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ، الصلاۃ والسلام علیک یا نبی اللہ اسی طرح آخر تک السلام کے ساتھ الصلاۃ کا لفظ بڑھا دے تو زیادہ بہتر ہے۔" (فضائل درود شریف: ص ۲۸

اتنے سارے بلند پایہ بزرگوں نے درودِ شریف کے ساتھ اور بلا درود بھی ندائے "یارسول اللہ" جائز ہی نہیں بلکہ زیادہ بہتر ہے، زیادہ اچھا ہے فرمایا تو پھر ناجائز کہنے والوں کو بقول حضرت شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند نجدی و وہابی اور بے دینوں کے زمرہ میں نہ رکھیں تو پھر کہاں رکھیں؟

اب اس بحث کو ترمذی شریف کی ایک حدیث پر ختم کر لیجئے۔ احقر کے ناقص خیال میں اور مزید دلائل کی حاجت نہیں ہے۔

حضرت عثمان حنیف فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے ایک نابینا صحابی کو دعا تعلیم فرمائی کہ نماز کے بعد دعا کرے کہ: اللّٰھم انی اسئلك واتوجہ الیك بمحمد نبی الرحمۃ یا محمد انی قد توجھت بك الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضیٰ لی اللّٰھم فشفعہ فی قال ابو اسحٰق ھذا حدیث صحیح (نسائی۔ ترمذی۔ ابن ماجہ وغیرہ) ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف توجہ کرتا ہوں تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلے سے جو نبیٔ رحمت ہیں۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آپؐ کے وسیلے سے رب کی طرف متوجّہ ہوں۔ میری اس حاجت میں کہ وہ میرے لیئے پوری کر دی جائے۔ اے اللہ میرے حق میں آپ کی شفاعت قبول فرما۔ حضرت عثمان بن حنیف فرماتے ہیں کہ نابینا صحابی نے جب نماز پڑھ کر یہ دعا کی تو وہ بینا ہو گئے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کبھی اندھے ہی نہیں تھے۔

اب ایک نظر میں جائزہ لے لیجئے کہ کن کن بزرگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارا ہے:

اور یہ مشتے نمونہ از خروارے ہے:

• حضرت شمس تبریزؒ

یارسول اللہ! حبیبِ خالق یکتا توئی　　برگزیدہ ذوالجلال پاک بے ہمتا توئی

• حضرت مولانا عبدالرحمٰن جامیؒ

زمہجوری برآمد جان عالم　　ترحم یا نبی اللہ ترحم

• شیخ محمد عبدالحق محدثؒ دہلوی

بہر صورت کہ باشد یارسول اللہ کرم فرما　　بلطف خود سر و سامان جمع بے سروپا کن

• حضرت شاہ ابوالمعالیؒ

گر نبودے یارسول اللہ ذاتِ پاک تو　　ہیچ پیغمبر نبردے دولتِ پیغمبری

• حضرت عارف باللہ حاجی حافظ شاہ امداد اللہؒ

ذرا چہرے سے پردے کو اٹھاؤ یارسول اللہ　　مجھے دیدار تم اپنا دکھاؤ یارسول اللہ

اگرچہ نیک ہوں بد ہوں تمہارا ہو چکا ہوں میں　　بس اب چاہو ہنساؤ یا رلاؤ یارسول اللہ

• حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا　　نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار

جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا　　بنے گا کون ہمارا ترے سوا غم خوار

• حضرت شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی

چہ وصفت کند سعدی ناتمام　　علیک الصلاۃ اے نبی والسلام

• حضرت شاہ ولی اللہ محدثؒ دہلوی

وصلّی علیک اللہ یا خیر خلقہ　　ویا خیر مامول ویا خیر واہب

• حضرت امام بوصیریؒ

یا اشرف الخلق مالی من الوذ بہ　　سواک عند حلول الحادث العمم

• حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

یا صاحب الجمال و یا سید البشر ٭ من وجہک المنیر لقد نور القمر

تلك عشرة كاملة

غیر اللہ کے نام پر ذبح

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ
(مائدہ)

"تم پر حرام کئے گئے ہیں مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کرتے وقت بت کا نام لیا گیا ہو۔"

اس آیتِ شریفہ کی تفسیر میں اختلاف واقع ہو گیا ہے۔ بعض مفسرین اور علماء کہتے ہیں کہ اس آیت میں ما اھل لغیر اللہ سے مراد وہ جانور ہے جس کی شہرت غیر اللہ کی نام سے دی گئی ہو۔ وہ حرام ہے۔ خواہ وہ ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا ہی نام لے کر کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو وہ بلا شک وشبہ حرام ہے۔ اس کے برخلاف جس جانور کے ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا گیا ہو وہ بلا شک وشبہ حلالِ طیب ہے، خواہ اس کی شہرت کسی کے بھی نام سے کیوں نہ کی گئی ہو۔

بہرحال یہ بھی ایک اختلافی مسئلہ ہے۔ اس پر ہم تنازعہ اور جھگڑے برپا کرنے اور ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے کی بجائے ایک بات پر جمع ہونے کی

کوشش کرتے یا ہر فریق اپنے راجح مسئلہ پر عمل پیرا ہو کر دوسروں سے تعارض نہ کرتا اور ایک دوسرے کو وہابی، نجدی، بدعتی، قبر پرست کے ٹائیٹلوں سے نہ نوازتے کتنا اچھا ہوتا۔ اس لیے کہ ہر فریق اپنے دعوے پر دلائل رکھتا ہے کسی طرف زیادہ، کسی طرف کم۔

اب آپ اس موضوع پر مفسرین کرام اور مفتیانِ عظام کے آراء وفتاوی ملاحظہ فرمائیے:۔

تفسیر جلالین میں ہے وما اھل بہ لغیراللہ ای ذبح علی اسم غیراللہ تعالیٰ والاھلال رفع الصوت وکانوا یرفعونہ عند الذبح لاٰلہتہم: انتہی یعنی وہ جانور جس پر ذبح کرتے وقت غیراللہ کا نام لیا گیا ہو وہ بھی حرام ہے اور اھلال کے معنے پکارنے اور نام لینے کے ہیں اور کفار ذبح کرتے وقت اپنے بتوں کا نام لے کر ذبح کرتے تھے۔

تفسیر حسینی میں لکھا ہے وما اھل بہ وحرام کرد آنچہ آواز بر دارند بآن در وقتِ ذبح لغیراللہ برائے غیر خدائے تعالےٰ بنام بتاں یا باسم پیغمبراں بکشند۔ (انتہی) ترجمہ اللہ نے حرام ٹھہرایا اس جانور کو جو غیراللہ کے لیے ذبح کیے جاتے وقت اس پر غیراللہ کا نام لیا جائے خواہ وہ بت ہوں یا پیغمبر۔

تفسیر بیضاوی میں ہے ای رفع بہ الصوت عند ذبح للصنم انتہی: یعنی ذبح کرتے وقت بت کا نام لیں۔

تفسیر جامع البیان میں لکھا ہے ما ذکر غیر اسم اللہ عند ذبحہ یعنی اس کے ذبح کرتے وقت غیراللہ کا نام لیا جائے۔

تفسیر درمنثور میں لکھا ہے کہ ما اھل بہ لغیر اللہ کے معنے ابن منذر نے حضرت ابنِ عباس رضؓ سے روایت کی ہے کہ ما ذبح ہیں اور ابن جریر نے ابنِ عباس رضؓ سے روایت کی ہے کہ وما اھل بہ لغیر اللہ للطواغیت یعنی جو جانور بتوں کے نام سے ذبح کئے جائیں۔

تفسیر موالم التنزیل میں ہے وما اھل بہ لغیر اللہ ای ما ذبح للاصنام والطواغیت واصل الاھلال رفع الصوت وکانوا یذبحون لآلھتہم ویرفعون اصواتھم بذکرھا یعنی ما اہل بہ لغیر اللہ کی معنی وہ جانور ہیں جو بتوں کے لیے ذبح کئے گئے ہوں کفار بتوں کے لیے ذبح کرتے تھے اور بلند آواز سے بتوں کا ذکر کرتے تھے۔

تفسیر احمدی وما اھل بہ لغیر اللہ معناہ ذبح بہ لاسم غیر اللہ مثل اللات والعزیٰ واسماء الانبیاء وغیر ذالک ترجمہ وہ جانور جو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا گیا ہو جیسے لات و عزیٰ اور انبیاء کے اسماء وغیرہ نیز تفسیر احمدی میں صاف لکھا ہے کہ ومن ھھنا علم ان البقرۃ المنذورۃ للاولیاء کما ھو الرسم فی زماننا حلال طیب لانہ لم یذکر اسم غیر اللہ علیھا وقت الذبح وان کانوا ینذرونھا ترجمہ یہاں سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اولیاء اللہ کے لیے نذر کردہ گائے جیسا کہ ہمارے زمانہ میں اس کی عادت ہے حلال طیب ہے اس لیے کہ ذبح کرتے وقت اس پر غیر اللہ کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کی نذر مانتے ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ نذر خاص اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے غیر اللہ کے لیے نہیں اس لیے ذبیحہ اپنی اصل حلیت پر قائم ہے پھر جب ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا یعنی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا تو

وہ بے شک حلال ہے ۔

اب آپ اس موضوع پہ مدرسہ باقیات صالحات ویلور کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا شیخ آدمؒ کا جواب ملاحظہ فرمائیے : لکھتے ہیں :

الجواب

"اولیاء اللہ کے نام پر گائے یا بکرا چھوڑنے سے مراد اگر مذکورہ گائے، بکرا ذبح کرکے فقراء و مساکین کو کھلا کر اس کا ثواب اولیاء اللہ کو پہنچانا ہے تو جائز ہے۔ خواہ اس کو ان کے مزار کے پاس ذبح کریں یا اور کہیں۔ اگر اس چھوڑنے سے مراد تقرب اولیاء اللہ کا ہے تو حرام بلکہ کفر ہے۔ فقط کذا فی کتب الفقہ۔"

کتبہ، شیخ آدم عفی عنہ

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
ضیاء الدین محمد کان اللہ تعالیٰ	محمد عبد الجبار عفی عنہ	محمد حسن باشاہ عفی عنہ
الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح
ضیاء الدین احمد امانی	سید محمد سعید کان اللہ تعالیٰ	عبد الرحیم عفی عنہ فاضل دیوبند

قد اجاد من افاد

محمد عبد العلی عفی عنہ

اس جواب سے معلوم ہوا کہ گائے، بکرا کسی بزرگ کے نام پر چھوڑنے اور اس کی شہرت دینے سے اس کی حلت میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، اس کا کھانا جائز و حلال ہے۔ اگر نیت تقرب الی اللہ کی ہو اور ثواب رسانی اولیاء کے لیے ہو۔

مولانا اسمٰعیل شہید لکھتے ہیں:

"اگر شخصے بزے راخانہ پرورکند تا گوشت او خوب شود
اورا ذبح کردہ و پختہ فاتحہ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ
خوانده بخورانند خللے نیست

ترجمہ اگر کوئی شخص بکرا گھر پہ پالے تاکہ اس کا گوشت اچھا بنے اور اس کو ذبح کرکے پکوا کر حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فاتحہ پڑھ کر کھلائیں تو کوئی خلل نہیں ہے۔

تقریر ذبیحہ از مولانا اسماعیل شہیدؒ

حضرتِ محترم کے اس فتوٰی میں یہ بات تو صاف ہو ہی گئی کہ کسی بزرگ کے فاتحہ پہ بکرا گائے وغیرہ گھر پہ پالنا جائز ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ذبح سے قبل ذبیحہ کی نسبت اگر غوث اعظمؒ یا کسی اور بزرگ کی طرف ہو جائے تو بھی اس کی حلت میں ذرہ برابر خلل نہ ہوگا۔ مطلب یہ کہ ذبح تو اللہ کے نام پہ ہوگا تقرباً للہ ہوگا اور ایصال ثواب کی نسبت ان بزرگ کی طرف ہوگی۔

اس فتوے سے یہ بات بھی سامنے آگئی کہ وہ لوگ جو حضرت سیدنا عبدالقادر جیلانیؒ کو غوث کے لقب سے پکارنے کو شرک سمجھتے ہیں خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں۔ حضرت مولانا اسمٰعیل شہیدؒ نے تو نہ صرف غوث لکھا ہے بلکہ غوثِ اعظم کے لقب سے یاد فرمایا ہے اور ان لوگوں کی غلطی بھی واضح ہو گئی جو سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب کا کھانا کسی کو دینے یا کھلانے سے قبل درست نہیں ہے۔

اس لیے کہ حضرت مولانا نے صاف لکھا ہے کہ حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کا فاتحہ پڑھ کر کھلائیں۔ کھلا کر فاتحہ دیں، نہیں لکھا۔ اس لیے کہ حدیث میں ہے: نیت المومن خیر من عملہ مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب "کفایۃ المفتی" میں رقمطراز ہیں۔ سوال وجواب دونوں پڑھ لیجیے:

سوال

۳ جانور اس نیت سے پالا جائے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی طرف سے اس کو قربانی کیا جائے گا اور اس کو مشہور کیا جائے کہ یہ جانور نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم کی قربانی کا ہے درست ہے یا نہیں؟

۴ جانور اس نیت سے پالا جائے کہ کسی بزرگ یا ولی کی نیاز دلائی جائیگی یعنی اس جانور کو ذبح کر کے اس کا ثواب اس ولی یا بزرگ کو پہنچایا جائیگا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

۳ " حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنے کی نیت سے جانور پالنا درست ہے۔ اور اس کی شہرت سے اس کے جواز میں کوئی نقصان نہیں آتا۔

۴ "یہ بھی درست ہے مگر نمبر (۳) اور نمبر (۴) میں عوام کی نیت اکثر طور پر یہ ہوتی ہے کہ جانور کی جان اس بزرگ کے تقرب حاصل کرنے کی جہت سے قربانی کی جائیگی اور یہ نیت اس جانور کو ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل کر دیتی ہے۔ اور وہ حرام

ہو جاتا ہے۔

کفایۃ المفتی: ج ۸ : ص ۲۷۶

حضرت مولانا کے اس جواب سے صاف معلوم ہو گیا کہ اگر عوام کی نیت بزرگ کے تقرب حاصل کرنے کی نہ ہو بلکہ تقرب حاصل کرنا اور تعظیم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو تو اس کے جائز و حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور بقول مولانا اس شہرت سے کہ ”اس جانور کی قربانی نبی کریم ﷺ یا کسی ولی کی طرف سے کی جائیگی“ اس کے جواز میں کوئی نقصان نہیں آتا اس کا کھانا حلال ہوگا۔ اب یہ کیا ضروری ہے کہ ہم اس کا کھانا مطلقاً حرام کہہ کر مسلمانوں کی نیتوں پر فیصلہ کر کے انھیں ثواب حاصل کرنے سے روکیں اور انھیں زبردستی حرام گوشت کھانے والوں میں داخل کر دیں۔

اب آپ ”بہار شریعت“ کا یہ فتوی بھی پڑھ لیں: لکھتے ہیں:

”بعض مسلمان گائے بکرا مرغ جو اس لیے پالتے ہیں کہ اُن کو ذبح کر کے کھانا پکوا کر کسی ولی اللہ کی روح کو ایصال ثواب کیا جائے گا یہ جائز ہے اور جانور بھی حلال ہے۔ اس کو ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل کرنا جہالت ہے۔ کیوں کہ مسلمان کے متعلق یہ خیال کرنا کہ اس نے تقرب الی غیر اللہ کی نیت کی ہٹ دھرمی اور سخت بدگمانی ہے مسلم ہرگز ایسا خیال نہیں رکھتا۔ عقیقہ اور ولیمہ اور ختنہ وغیرہ تقریبوں میں جس طرح جانور کو ذبح کرتے ہیں اور بعض مرتبہ پہلے ہی سے متعین کر لیتے ہیں کہ فلاں موقع اور فلاں کام کے لیے ذبح کیا جائے گا۔ جس طرح یہ حرام نہیں،

وہ بھی حرام نہیں۔"

بہار شریعت حصہ پانزدہم: ص ۹۹

چناں چہ مولانا عامر عثمانی فاضل دیوبند مدیر تجلی بھی رقمطراز ہیں:

"غیر اللہ کے لیے قربانی کا جانور پالنا ایک معنی میں تو جائز ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ہم اپنے والد کے لیے ایک جانور پالیں اور نیت یہ ہو کہ اسے اللہ کے نام پہ ذبح کریں گے اور اس کا ثواب ہمارے والد کو مل جائے گا، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔"

تجلی۔ دیوبند: ص ۲۹: فروری ۱۹۶۰ء

اور مولانا محمد عبد العزیز خان فتحپوری لکھتے ہیں:۔

"کسی کے ایصالِ ثواب کے لیے جانور پالنا اور اسے فربہ کرنا، پھر تاریخ فاتحہ پر اس کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ ذبح کرنا جائز ہے۔"

اب آپ حضرت مولانا غلام رسول صاحب کے فتوے کا خلاصہ لفظ بہ لفظ ملاحظہ فرمائیں:

"جو بھی جانور غیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے یعنی اس کے ذبح کرنے کے وقت غیر خدا کا نام لیوں حرام ہے۔ جیسا کہ کافروں کی عادت تھی کہ پیغمبروں یا بتوں کے نام پر قتل کرتے تھے۔ کسی جانور کو ذبح کرتے

وقت غیر خدا کا نام نہ لے کر محض غیر خدا کے نام اس کو شہرت دینا اور نامزد کرنا اس کو حرام نہیں کر دیتا۔ حتیٰ کہ وہ جانور جنھیں کفار آتشکدوں اور بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں اگر مسلمان اس کو اللہ کا نام لے کر ذبح کرے تو ان کا کھانا جائز ہے۔ کما فی العالمگیری نقلا من تاتارخانی مسلم ذبح شاۃ المجوسی لبیت نارھم او الکافر لالھتھم توکل لانہ سمی اللہ تعالیٰ : انتہی

ترجمہ: جیسا کہ عالمگیری میں تاتارخانی سے منقول ہے: کسی مسلمان نے مجوسی کی بکری کو ذبح کر دیا جو مجوسی نے اپنے آتش کدہ کے نام پر چھوڑ رکھا تھا یا کافر نے اپنے بتوں کے نام پر تو اس بکری کا گوشت کھایا جائے گا اس لیے کہ مسلمان نے اس پر اللہ کا نام لے کر اس کو ذبح کیا ہے اور ما اھل لغیر اللہ سے مراد کفار کا ذبیحہ ہے جو لات و عزیٰ کے نام ذبح کرتے ہیں اور وہ حرام ہے۔ کذا فی تفسیر الحسینی وقال فی الجلالین ما اھل بہ لغیر اللہ بان ذبح علی اسم غیرہ انتہی : وقال فی البیضاوی وما اھل بہ لغیر اللہ ای رفع الصوت لغیر اللہ بہ کقولھم باسم اللات والعزیٰ عند ذبحہ"

(فارسی سے ترجمہ و انتخاب) فتاوی حضرت مولانا غلام رسول صاحب

اب آخیر میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کی رائے گرامی پڑھ کر بحث ختم کر لیجیے :

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدث نے فوز الکبیر فی اصول التفسیر میں مااھل کے معنی ماذبح لکھا ہے۔ یعنی ذبح کرتے وقت جس جانور پہ بت کا نام لیویں سو وہ حرام ہے۔
منتخب از تفسیر مجدی: ص ۱۵۷

قرآن پاک کی یہ آیت شریفہ: فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ ان کنتم بآیتہ مومنین: ترجمہ: جس جانور پہ اللہ کا نام لیا جائے اس میں سے کھاؤ اگر تم اس کے احکام پہ ایمان رکھتے ہو۔ بھی مذکور توضیحات کی تائید کرتی ہے۔ اور بس !!

نذرونیاز

ہمارے بعض بھائی جیسے ہی لفظ نذرونیاز سُن لیتے ہیں اُن کے اذہان پر قبوری شریعت کا تصوّر ناچنے لگتا ہے اور بے سوچے سمجھے یہ شرک ہے کفر ہے کی گردان شروع کر دیتے ہیں۔ خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح مسلمان بھائیوں میں پھوٹ اور عداوت کے بیج بو دیتے ہیں۔ اس لیے بہتر معلوم ہوا کہ اس موضوع پر بھی علمائے کرام اور مفتیانِ عظام کے آراء و فتاویٰ پیش کر دیے جائیں۔

سب سے پہلے آپ یہ جان لیں کہ نذرونیاز کے معنے لغت میں کیا ہیں؟

"نذر کے معنے 'بُرہان قاطع' میں تحفۂ درویشاں لکھا ہے اور 'تفسیرِ احمدیہ' میں صدقہ و خیرات لکھا ہے۔ یہی معنی نیاز کے ہیں۔ طریقہ اس کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص نذر یا منت مانے کہ اے پاک پروردگار اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو اس قدر مال یا کھانا فلاں درویش یا فلاں مدرسہ یا فلاں خانقاہ کے فقراء

کو کھلاؤں گا یا فلاں بزرگ کی فاتحہ یا روح کو ثواب پہنچاؤں گا۔
تو یہ سب جائز ہے۔"
انوارِ آفتابِ صداقت: ص ۴۹۴

اب آپ ہی سوچیے اس میں کون سی بات شرک کی پائی جاتی ہے۔
نہیں ہرگز نہیں! تو پھر ہم اس کو حرام اور ناجائز بتا کر درویشوں، فقیروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو نقصان پہنچا کر اور بزرگوں کو ثواب سے محروم کر کے ہم کون سا ثواب کمانا چاہتے ہیں؟

اگر یہ نذر و نیاز ناجائز اور حرام ہوتی تو حضرت مولانا شاہ اسحٰق صاحب جن کی سختی مشہور ہے، اس کے جائز ہونے کا فتویٰ ہرگز نہیں دیتے۔
'مائۃ مسائل' میں آپ کا فتویٰ موجود ہے۔ پڑھ لیں۔

"اگر ایں طور خواہد گفت کہ اگر حاجتِ من خدا برآرد بہ فقرا وخادمانِ مزارِ فلاں بخورانم۔ پس نذر صحیح خواہد شد و وفا لازم"
ترجمہ: اگر اس طرح کہے کہ اگر خدا میری حاجت برلاوے تو فلاں بزرگ کے مزار کے فقرا اور خادموں کو کھانا کھلاؤں گا۔
پس نذر صحیح ہوگی اور اس کا پورا کرنا لازم ہوگا۔
مائۃ المسائل: ص ۸۲

مذکور فتویٰ بتاتا ہے کہ نذر نہ صرف جائز ہے بلکہ نذر کرنے والے پر

نذر کو پورا کرنا لازم و واجب بھی ہو جاتا ہے ۔ جیسا کہ حدیث میں ہے : من نذر نذرا لطاقہ فلیف بہ (رواہ ابوداؤد)

اب آگے بڑھنے سے آگے فتاوی رشیدیہ کا یہ سوال وجواب بھی پڑھ لیں:

السوال

بادشاہ یا نواب کو نذر دینا کیسا ہے ؟ اور جو پیر یا ولی کی نذر کی جاتی ہے وہ کیسی ہے ؟

الجواب

"بادشاہ یا نواب کو ہدیہ دیا کرتے ہیں۔ اگر رشوت یا بوجہ معصیت کے نہیں تو محض اخلاص مندی ہے تو درست ہے اور بزرگوں کو بھی جو دیتے ہیں وہ ھدیہ ہے، درست ہے۔ جو اموات اولیاء کی نذر ہے تو اس کے اگر یہ معنی ہیں کہ اس کا ثواب ان کی روحوں کو پہنچے تو صدقہ ہے' درست ہے۔ اور جو نذر بمعنی تقرب اُن کے نام پہ ہے تو حرام ہے۔" فقط واللہ اعلم

فتاوی رشیدیہ : ج ۱ : ص ۱۴

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے بھی کیا لکھا ہے کہ اموات اولیاء کی نذر درست ہے ۔ البتہ آپ نے بتایا ہے اگر نذر بمعنی تقرب الی غیر اللہ والی ہے تو حرام ہے اب یہ کیا ضروری ہے کہ ہم یہ فیصلہ کرلیں کہ ہر نذر کرنے والا تقرب الی غیر اللہ کی ہی نیت سے کرتا ہے ۔ اگر کوئی ایسا کرنے والے ہوں بھی تو انہیں

صحیح طریقہ نذر کا بتانا علماء کی ذمہ داری ہے۔

مزار پر کھیر پکا کر کھلانے کی نذر کرنے سے متعلق "کفایۃ المفتی" کا یہ سوال وجواب بھی پڑھ لیجیے۔ لکھتے ہیں:

السوال

بعد پوری ہونے مراد کے دودھ چاول چینی وغیرہ کسی مزار کے قریب لے جاکر کھیر پکانا اور صاحبِ مزار کی نیاز کرکے اپنے احباب کو جمع کرکے وہیں بیٹھ کر کھانا اور کھلانا شرعاً کیسا ہے؟

الجواب

"نیت اگر یہ تھی کہ مراد پوری ہونے پر میں فلاں بزرگ کے مزار پر کھیر پکاؤں گا اور احباب کو کھلاؤں گا تو یہ منت ہی درست نہیں اور اگر یہ تھی کہ فلاں بزرگ کے مزار کے فقراء کو کھلاؤں گا تو یہ منت درست ہے۔ مگر وہاں جاکر پکانا یا قبر کے پاس لے جاکر تقسیم کرنا ضروری نہیں، وہاں کے فقراء کو اپنے گھر بلا کر بھی دے سکتا ہے۔"

کفایۃ المفتی: ج ۱: ص ۲۱۱

حضرت مولانا نے پہلی صورت یعنی 'کھیر پکاؤں گا اور احباب کو کھلاؤں گا' کو درست نہیں ہے فرمایا ہے۔ اور دوسری صورت 'کھیر پکاؤں گا اور فلاں بزرگ کے مزار کے فقراء کو کھلاؤں گا' درست ہے فرمایا ہے۔ پہلی صورت کو نادرست کہنا کی وجہ یہ ہے کہ یہ نذر ہے اور نذر کا کھانا فقراء ہی کو دیا جائے گا، اغنیاء کو نہیں اس فتوے سے مزید یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نذر میں تعین طعام بھی کیا جاسکتا ہے۔

اب آپ بانیٔ باقیات صالحات کے استاد محترم حضرت مولانا حکیم زین العابدین مائلؔ ویلوری کا فتوی پڑھ لیں۔
لکھتے ہیں:

"مراد نذر کرنے سے جانور یا طعام یا نقد و جنس کے واسطے ارواحِ بزرگان، اموات کے نیت کرنا ھدیہ کرنے کے ہے ثواب کو اس کے انہوں کے حضور ہیں، پس نذر کرنا جانور یا نقد یا جنس کا اس نیت سے کہ ثواب ذبح کا اس کے، یا گوشت کا اس کے یا ثواب نقد و جنس کا جو صرف ہیں زندگان محتاج کے آوے فلاں بزرگ کی روح کو ھدیہ ہے جائز و روا ہے۔"
(مرأۃ الحق)

آثار و تبرکات

انبیاء علیھم السلام اور اولیائے کرام کے آثار و تبرکات کی تعظیم و احترام شرعاً و عقلاً ثابت ہے اور اہلِ سنّت والجماعت اس پر متفق ہیں کہ جس طرح برگزیدہ اور مقبولانِ خدا کی ذاتِ گرامی خیر و برکات کا سرچشمہ ہوتی ہے اسی طرح ان کے آثار و تبرکات بھی منبع خیر و برکات ہوتے ہیں۔

چناں چہ قرآنِ پاک میں ہے:

اذھبوا بقمیصی ھذا فالقوہ علی وجہ ابی یاتی بصیرا

ترجمہ: میری یہ قمیص لے جاؤ اور اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دو، ان کی آنکھیں روشن ہو جائینگی۔

بنو اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جوتیاں، عصا، ہارون ؑ کی پگڑی، من و سلویٰ کا ایک تھیلا تھا۔ دشمنوں سے لڑائی کے وقت اس کا استعمال کیا جاتا تھا۔ جس کی برکت سے فتح حاصل ہوتی تھی۔

بخاری شریف کی روایت ہے: ارسلنی اھلی الی ام سلمۃ بقدح من ماء وکان اذا اصاب الانسان عین او شئی بعث الیھا مخضبۃ فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت

تمسکه فی جلجل من فضت فخضخضتہٗ لہ فشرب منہ قال فا
طلعت فرأیت شعرات حمراء ۔

عثمان بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے پانی کا ایک پیالہ دے کر حضرت اُمّ سلمہؓ کی خدمت میں بھیجا اور یہ عادت عام تھی کہ جب کسی شخص کو نظر لگتی یا کچھ بیماری آتی وہ حضرت امّ سلمہؓ کی خدمت میں پانی کا ایک پیالہ بھیج دیا کرتے تھے ۔ حضرت امّ سلمہؓ ایک موئے مبارک نکالتیں جو وہ اسے چاندی کی ایک ڈبیہ میں رکھا کرتی تھیں اور اُسے پانی میں ڈبو کر ہلا دیتیں ۔ بیمار اس پانی کو پی لیا کرتا تھا ۔ میں نے ڈبیہ کے اندر دیکھا تو وہاں سرخ رنگ کے چند بال تھے ۔

مذکورہ آیت شریفہ اور بخاری شریف کی اس حدیث نے واضح کردیا کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی تعظیم اور اس کا احترام صحابۂ کرامؓ کے وقت سے ہی جاری ہے اور آثار شریفہ سے انواع واقسام کے برکات حاصل ہوتے تھے ۔ اور بیماریاں دفع ہوتی تھیں اور آج بھی خیر و برکات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے ۔ یہی نہیں صحابۂ کرام میں سے حضرت خالد بن ولیدؓ جنگ کے وقت نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اپنی پگڑی میں رکھتے تھے ۔ اس کی برکت سے آپ کو کسی بھی جہاد میں شکست نہیں ہوئی ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادرِ مبارک حضرت کعب بن زبیرؓ کے پاس تھی ۔ حضرت معاویہؓ نے ان کی اولاد سے تیس ہزار درہم میں خریدی تھی ۔ آپ

اب آپ مختلف مفتیانِ کرام کے فتاوی ملاحظہ فرمایئے :

موئے مبارک کی تعظیم کے سلسلہ میں فتاویٰ رحیمیہ میں ہے :۔

سوال

یہ مشہور ہے کہ اکثر بڑے شہروں میں اور دیہات میں حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک ہیں کیا یہ درست ہے اور کیا اس کی تعظیم کی جائے۔

الجواب

"حدیثِ شریف سے ثابت ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے موئے مبارک صحابۂ کرامؓ کو تقسیم فرمائے تھے فتاویٰ ابنِ تیمیہ میں ہے: فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حلق راسہ واعطی نصفہ لابی طلحہ ونصفہ قسمہ بین النّاس: ج ۱: ص ۴۳۔ تو اگر کسی کے پاس ہو تو تعجب کی بات نہیں اگر اس کی صحیح اور قابلِ اعتماد سند ہو تو اس کی تعظیم کی جائے۔ اگر سند نہ ہو اور مصنوعی ہونے کا بھی یقین نہیں تو خاموشی اختیار کی جائے نہ اس کی تصدیق کرے اور نہ جھٹلائے نہ تعظیم کرے اور نہ اہانت۔" فقط

فتاوی رحیمیہ: ج ۲: ص ۲۷۷

ہم نے ہمارے اساتذۂ کرام سے سنا تھا کہ اگر سند نہ بھی ہو اور ایک مسلمان کے دعوے کو سچ جان کر موئے مبارک کی تعظیم کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

اب آپ بانیٔ مدرسۂ باقیات صالحات کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

السوال

عرصۂ دراز سے حضور انور شفیع محشر محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک کی زیارت ہر سال جشنِ میلاد کے ساتھ کراتے ہیں۔ آج کل میں کوئی مولوی صاحب تشریف لائے ہیں آکر موئے مبارک کی زیارت وغیرہ کے لیے کوئی سند واحادیث نہیں ہے کہہ کے زیارت کے نہ کرنے کے لیئے تاکید فرماتے ہیں اور ہم سب کے دل بہت پراگندہ کئے ہیں۔ لہٰذا آپ معقول جوابات تحریر فرما کر ہم کو تشفی بخشئے :

الجواب

" جانئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تبرکات مثلاً موئے مبارک وغیرہ کو تبرک سمجھنا ثابت ہے ۔ چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سال حج گزارے بعد سر کی حجامت احرام کھولنے کے لیے جو لیتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی لیئے۔ اس کو بارا اڑالے گیا۔ اور ایک سال سرِ مبارک منڈواکے آدھے مبارک بال ایک صحابیؓ کو دیئے باقی آدھے کو لوگوں میں تقسیم کر دئیے تھے سو اس کو بعض نگل گئے اور بعض ان کو اپنے کفن میں تبرکاً رکھنے کی وصیت کئے تھے۔ بعض اس کو عطر وغیرہ خوش بوئی کے چیزوں میں رکھ کے نگاہ رکھتے تھے۔ سوائے اس کے آپؐ وضو کرتے وقت ریش مبارک سے کوئی ایک مبارک بال گرا تو صحابۂ کرام ایک دوسرے پر گر کر اٹھا لیتے تھے۔ ایسا اس کو تبرک سمجھ کر حفاظت کرنا متقدمین و متاخرین میں جاری تھا۔

چناں چہ حدیث وسیر کی معتبر کتابوں میں یہ بات آئی ہے اور وہ سایہ جو ابر کا آپؐ پر رہا کرتا تھا ویسا اس میں بھی رہنا کہتے ہیں سو یہ لازم نہیں۔ کیوں کہ ابر کا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر سایہ کرنا نبوت کے آگے کی خصوصیت تھی۔ بعدِ نبوت کہیں مذکور نہیں۔ سوائے اس کے ابر کل پر سایہ کرنے سے جزو پر بھی سایہ کرنا لازم نہیں۔ یہ شبہ بیجا ہے۔ لیکن اس زمانے میں جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا موئے مبارک ہے کر کے زیارت کرتے ہیں اس میں محذوراتِ شرعی نہ ہو تو جائز ہے اور اس آثار کو آثار نہیں کر کے انکار نہیں کرنا۔ کیوں کہ صحیح موئے مبارک ہونا ہو سکتا ہے ایسا ہی بہت سے لوگ جو سید کہلاتے ہیں ان کی بھی تعظیم کرنا اور بلا دلیل انکار نہیں کرنا۔ کیوں کہ وہ سید ہونا ممکن ہے۔ لیکن اس زیارت کے لیئے روز دن کی تعئین سلف سے ثابت نہیں۔ اس کے سند اں لکھنے ہم کو فرصت نہیں:

دفتر فتاوی باقیات: غیر مطبوعہ: ص ۲۰۳

آثار و تبرکات کی تعظیم کے سلسلہ میں اوپر ذکر کردہ پہاڑوں جیسے مضبوط دلائل و براہین کی روشنی میں بھی بعض لوگوں کی دیدہ دلیری دیکھنے کے قابل ہے کہ انبیاء اور اولیاء کے آثار و تبرکات اور ان کی تعظیم کو انکار کرنے کے ساتھ ان کا مذاق بھی اڑاتے ہیں حالاں کہ ملک کا کوئی بڑا آدمی مر جاتا ہے تو اس کے جنازے کے پیچھے ننگے سر ادب کے ساتھ سر جھکائے چلنے اور اگر پھولوں کا باسی ہار پیش

کیا جائے تو انتہائی عقیدت کے ساتھ جھک کر لینے اور اس کو پیشانی سے لگا کر فرشی سلام کرنے میں انھیں ذرا بھی جھجک معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف انبیاء اور اولیاء کے تبرکات پیش کرنے والوں کو غصہ اور نفرت سے جھڑک دیتے ہیں حالانکہ بڑے بڑے علمائے کرام اور بزرگوں کا رویّہ آثار و تبرکات کے ساتھ مؤدبانہ بلکہ عاشقانہ رہا ہے۔ چناں چہ دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی لکھتے ہیں:

> "حضرت مولانا (مولانا رشید احمد گنگوہی) کے ہاں تبرکات میں حجرۂ مطہرہ نبویہ کے غلاف کا ایک سبز ٹکڑا بھی تھا۔ بروز جمعہ کبھی کبھی حاضرین و خدام کو جب ان تبرکات کی زیارت خود کرایا کرتے تھے تو صندوقچہ خود اپنے دستِ مبارک سے کھولتے اور غلاف کو نکال کر اوّل اپنی آنکھوں سے لگاتے اور منہ سے چومتے پھر اوروں کی آنکھوں سے لگاتے اور ان کے سروں پر رکھتے اس امر کو ہزاروں نے ملاحظہ کیا ہوگا بھلا یہ امر وہابیہ کے نزدیک بدعت و حرام نہیں تو کیا ہے؟"
>
> الشہاب الثاقب: ص ۵۲

یہ دیوبند کے شیخ المشائخ ہیں۔ دیکھ رہے ہیں آپ تبرکات کی زیارت خود بھی کر رہے ہیں اور دوسروں کو بھی کراتے ہیں۔ اور ان کے سروں پر خود اپنے ہاتھوں سے رکھتے ہیں۔

ان بزرگوں کا یہ قابلِ تحسین رویہ غلافِ شریف کے ساتھ تھا اب خاکِ شفاء سے متعلق بھی حضرت مدنیؒ کا بیان پڑھ لیجیۓ:

" احقر ربیع الاول ۱۳۱۹ھ میں ہمراہی بھائی محمد صدیق صاحب حاضرِ خدمت ہوا تھا تو بھائی صاحب سے پہلی ہی حاضری میں حضرت قدس اللہ سرہ العزیز نے دریافت فرمایا کہ حجرۂ شریف علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی خاک بھی لائے ہو یا نہیں۔ چوں کہ وہ احقر کے پاس موجود تھی اس لئے باادب ایستادہ پیشِ خدمت اقدس کیا۔ نہایت وقعت وعظمت سے قبول فرماکر سرمہ میں ڈلوایا اور روزانہ بعد عشاء خوابِ استراحت فرماتے وقت اتباعاً للسنۃ اس سرمہ کو آخر عمر تک استعمال فرماتے رہے اس قصّہ سے عام خدّام واقف ہیں۔"

الشہاب الثاقب: ص ۵۲

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ مبارکہ کے اطراف واکناف اور روضۂ اقدس پر بھی جو غبار جمتا ہے خدّام جمع کرکے عاشقانِ رسول ﷺ میں تقسیم کرتے ہیں جس میں بہت ساری بیماریوں کی شفاء ہے اگر ایسا نہ ہوتا، دارالعلوم کے شیخ الحدیث کا قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسدِ اطہر کے ذرّے ذرّے کے ساتھ اور آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس کے نسبت رکھنے والی ہر شئ کے ساتھ محبّت وعظمت سے بھرا ہوا نہ ہوتا تو نہ خاکِ شفاء لے آتے اور نہ ہی اپنے بچوں کو روضۂ اقدس کے اطراف واکناف لٹاتے۔ اس پر سند چاہیئے تو آپ کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمائیے:

"احقر نے سوال کیا کہ بعد چالیس روز کے جالی شریف میں اندرونِ حجرۂ مطہرہ اہلِ مدینہ بچوں کو داخل کرتے ہیں اور خادم روضۂ مطہرہ اس کو لے جاکر سامنے روضۂ اقدس کے قبلہ کی طرف لٹا دیتا ہے اور دعا مانگتا ہے یہ فعل کیسا ہے؟ تو آپ نے استحسان فرمایا اور پسند کیا۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ کیا وہابیہ خبیثیہ ان افعال کو جائز کہتے ہیں؟ کبادہ ان کو وہ شرک و کفر و بدعت وغیرہ نہیں کہتے۔ اسی وجہ سے ہم نے اپنے بچوں کو بھی مدینہ میں بارہا حجرۂ مطہرہ نبویہ میں داخل کیا ہے۔"

الشہاب الثاقب: ص ۵۴

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بقول شیخ الحدیثؒ انبیاء اور اولیاء کے مزارات پہ تبرکاً بچوں کو لٹانے اور ان کی دنیا و آخرت کی کامیابی وغیرہ کے لیئے دعا کرانے سے روکنا اور اس کو شرک و بدعت کہنا نجدیوں وہابیوں کا کام ہے۔ اہلِ سنّت کا کام نہیں ہے وہ تو اس کو برکت سمجھتے ہیں۔ چناں چہ مولانا عبدالعزیز خان فتح پوری لکھتے ہیں:۔

"بچہ پیدا ہوتے ہی نہلا دھلا کر مزاراتِ اولیاء کرام پر لے جانا باعث برکت ہے۔"

زیارت قبور: ص ۸

اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جبۂ شریف اور دیگر انبیاء و اولیاء کے آثار کا احترام بھی وہ جہاں کہیں بھی ہوں اہل السنت میں مسلسل جاری ہے چناں چہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جبۂ شریف کے ساتھ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا احترام کس درجہ کو پہنچا ہوا تھا ملاحظہ فرمائیے:

"فرمایا (اشرف علی تھانویؒ) کہ جب حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا جبۂ شریف تھانہ بھون میں آتا ہے تو میں اس کے قیام گاہ کی طرف کو پیر نہیں پھیلاتا بوجہ ادب کے۔ اب کوئی شبہ نہ کرے کہ قرآن شریف کا اتنا احترام نہیں کیا جاتا۔ اس سے جبۂ شریف کے احترام کی زیادتی کلام مجید پر لازم آتی ہے۔ فرمایا: کہ اس کا جواب یہ کہ قاعدہ ہے کہ نئی چیز کا احترام طبعی طور پر زیادہ ہوتا ہے مثلاً کچھ لوگ اپنے شیخ کی خدمت میں بیٹھے ہوں اور کوئی دوسرے بزرگ آجائیں اور لوگ اٹھ کر ان سے مصافحہ کرنے چلے جائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جبۂ شریف تو کبھی کبھی آتا ہے، اس کا یہ احترام ہم کرسکتے ہیں اور قرآن مجید کا اس قدر احترام نہیں کرسکتے۔ کیوں کہ وہ ہمارے پاس ہر وقت موجود ہے۔"

حسن العزیز: ج ۲: ص ۲۷

جن بزرگوں کی بزرگی ان کی عالمانہ شان اور ان کی قلبی بصیرت جس درجہ بلند رہی ہے وہ ایسی معیار پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارکہ

کے احترام و تعظیم میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار مبارکہ کی بات تو عرش سے اونچی ہے بڑے بڑے علمائے کرام کا رویہ اولیاء اللہ کے آثار کے ساتھ خود کیا رہا ہے۔ مجالس الحکمہ کا مندرجۂ ذیل واقعہ پڑھ لیجئے ۔ پتہ چلے گا۔!

" احقر نے دیکھا خلاف معمول حضرت والا (مولانا اشرف علی تھانویؒ) کے سرہانے ایک تسبیح سیاہ رنگ بڑے بڑے دانوں کی رکھی ہے۔ عرض کیا یہ تسبیح کہاں سے آئی؟ فرمایا: حضرت حاجی صاحب کی ہے۔

قصہ اس کا یہ ہوا کہ یہ ایک شخص کے پاس تھی۔ ان کو ضرورت پیش آئی۔ مجھ سے انہوں نے کہا حضرت حاجی صاحب کا تبرک ہے اگر کوئی خریدار ہو تو چھ سو روپے کے بدلے میں اس کو علاحدہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرے ذمہ اسی قدر قرض ہے۔ سو مجھے چھ سو روپے دینا مشکل تھے۔ حق تعالیٰ سے دعا کی کہ یہ تسبیح ضائع نہ ہو۔ یہ شخص اس کو ذریعۂ معاش بنائے گا۔ قدرت خدا کہ اگلے دن وہ خود آئے اور کہا مجھے یہ خیال ہوا کہ تبرکات کی قیمت لینا بے ادبی ہے۔ اور میں اس کے رکھنے کا بھی اہل نہیں ہوں۔ لہٰذا اس کی حفاظت اسی میں سمجھتا ہوں کہ آپ رکھ لیں۔ یہ جب سے میرے پاس ہے کبھی کبھی اس پر کچھ پڑھ لیتا ہوں۔ بعض حاضرین نے اس کو آنکھوں سے لگایا اور بعض حضرات نے حضرت والا کی

اجازت سے تھوڑی دیر اس پر تسبیح پڑھی۔

مجالس الحکمہ: ص ۲۶۶

آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ مشتے نمونے از خروارے ہے۔

○

انگوٹھے چومنا

اذان میں اشہد ان محمدًا رسول اللہ کہتے وقت بعض حضرات انگوٹھے چومنے والی حدیث کو ضعیف بتا کر انگوٹھے چومنے سے منع کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ان کا یہ منع کرنا دو باتوں سے خالی نہ ہوگا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اُن کو اس بات کا علم ہی نہیں ہے ضعیف حدیثوں کا حکم کیا ہے؟ اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں مگر کسی ذاتی مصلحت کی وجہ سے مانتے نہیں ہیں۔

پہلی بات کا علاج یہ ہے کہ وہ کسی عالم ربّانی کی طرف رجوع کریں تو وہ بتادیں گے۔ فضائل اعمال میں حدیثِ ضعیف پر عمل کرنے میں علمائے محققین کا اتفاق ہے۔ چناں چہ "اربعین" میں امام ابوزکریا نووی رح لکھتے ہیں: قد اتفق العلماء علی جواز العمل بالحدیث الضعیف فی فضائل الاعمال: ترجمہ: فضائل اعمال میں حدیث ضعیف پر عمل کے جائز ہونے پر علماء کا اتفاق ہے۔

دوسری بات کا علاج ہمارے پاس دعائے خیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اس بات کو اچھی طرح نوٹ کر لیجیے کہ فقہائے احناف نے بوقتِ شہادتین انگوٹھے چومنے کو مستحب بتایا ہے۔ جب یہ بات احناف کے پاس مستحب ہے تو اس کو منع کرنے والوں اور مطلقاً ناجائز بتانے والوں کو بار بار سوچنا چاہیے کہ وہ حنفی ہیں بھی یا نہیں؟

اب آپ سب سے پہلے انگوٹھے چومنا فقہائے کرام کے پاس مستحب ہونے پر حضرت شمس العلماء عبد الوہاب قدس سرہٗ بانئی باقیات صالحات ویلور کا فتوی پڑھ لیں۔

سوال

اذان میں اشھد ان محمدا رسول اللہ کہتے وقت سامعین انگوٹھوں کو بوسہ دیتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

الجواب

"وھو الموفق للصواب بعض کتب فقہ میں آیا ہے کہ اذان میں اشہدان محمدا رسول اللہ کہتے وقت انگوٹھوں کو چوم کر آنکھوں پر لگانا مستحب ہے" کتبہ عبد الوہاب کان اللہ لہٗ

غیر مطبوعہ دفتر فتاوی

حضرت بانئ باقیات کا فتویٰ پڑھ لینے کے بعد مجھے امید ہے کہ بوقتِ شہادتین انگوٹھے چومنا فقہائے احناف کے پاس مستحب ہونے میں آپ کو کوئی شک باقی نہ رہا ہوگا پھر بھی دل کے کسی کونے میں تذبذب ہو تو چلیئے دار العلوم دیوبند کا فتوی بھی ملاحظہ فرمالیجیے!

سوال 246

اذان میں بوقتِ شہادتین انگوٹھوں کو بوسہ دینا کیسا ہے؟ جو شخص اس سے منع کرے اس کی اقتداء نماز میں جائز ہے یا نہیں اور جو انگوٹھوں کو بوسہ نہ دے گا گنہ گار ہے یا نہ؟ اگر بوسہ دینا مستحب یا سنت ہے تو اس کی دلیل کیا ہے؟

الجواب

"استحباب تقبیل ابہامین کی دلیل شامی کی یہ عبارت ہے: یستحب ان یقال عند سماع الاولیٰ من الشہادتین صلی اللہ علیک یارسول اللہ وعند الثانیۃ منھما قرۃ عینی بک یارسول اللہ ثم یقول اللّٰھم متعنی بالسمع والبصر بعد وضع ظفری الابہامین علی العینین فانہ علیہ السلام یکون قائداً لہ فی الجنۃ کذا فی کنز العباد وقہستانی ونحوہ فی الفتاوی الصوفیہ وفی کتاب الفردوس من قبّل ظفری ابہامیہ عند سماع اشھد ان محمداً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی الاذان انا قائدہ ومدخلہ فی صفوف الجنۃ وتمامہ فی حواشی البحر للرملی عن المقاصد الحسنۃ للسخاوی وذکر ذالک الجراحی واطال ثم قال ولم یصح فی المرفوع من کل ھذا شئ الخ۔ شامی: ج ۱: ص ۲۶۷ (باب الاذان)

آخر عبارت شامی سے یہ بھی واضح ہوا کہ کوئی مرفوع حدیث صحیح اس بارے میں نہیں ہے۔ غایت یہ کہ ضعیف حدیث پر بھی

فضائل اعمال میں عمل کرنا درست ہے۔ مگر اس کی شرط یہ ہے کہ اس فعل کو مسنون نہ سمجھے، کذا فی الدر المختار۔ پس چوں کہ بعض عوام کو غلو ہو گیا اس کو سنّت سمجھ کر کرتے ہیں۔ تارک پر طعن و ملامت کرتے ہیں اس لیے ترک اس کا علمائے محققین احوط سمجھتے ہیں، اور وہ شخص گنہ گار نہیں، اقتدا اس کی درست ہے "!

فتاوی دار العلوم: ج: ص ۱۰۶

مذکور فتوی سے یہ بات آپ پر واضح ہو گئی ہو گی کہ اذان میں بوقت شہادتین انگوٹھے چومنا بلا شک وشبہ مستحب ہے اس لیے کہ ضعیف حدیث پر بھی فضائل اعمال میں عمل کرنا درست ہے اور کسی بھی چیز کا مستحب ہونا حدیثِ ضعیف سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے مذکور فتوے میں یہ بات بھی ہے کہ انگوٹھے چومنے کو سنّت نہ سمجھا جائے مستحب سمجھ کر چوم سکتے ہیں۔ یعنی سنّت کو سنّت کے درجے میں اور مستحب کو مستحب کے درجہ میں رکھیں جیسے نماز کی نیت زبان سے کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہے فقہاء نے مستحب بتایا ہے لہٰذا ہم مستحب سمجھ کر ہی زبان سے نیت کرتے ہیں نہ کہ سنّت سمجھ کر۔ اس لیے کہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سب کے سب دل سے نیت کرتے تھے۔

انگوٹھے چومنا ایک حدیث سے نہیں کئے ضعیف حدیثوں سے ثابت ہے

تاہم ہمارے ان بھائیوں کی دیدہ دلیری اور علمی خیانت دیکھنے کے قابل ہے جو حدیث ضعیف کو حدیثِ موضوع سمجھ کر اس کا ترجمہ من گھڑت بھی کر دیتے ہیں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اذان میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی سن کر انگوٹھے چومنے والے

مستحب ومباح سمجھ کر چومتے ہوں تو دیکھنے والے حضرات کو پریشانی کیوں لاحق ہو جاتی ہے ؟ ایسے ہی لوگوں کے حق میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ؒ نے "افاضات الیومیہ" میں عید کے دن سویاں پکانا جائز ہونے کا فتویٰ دینے کے بعد لکھتے ہیں :

> "آج کل اعتدال بہت کم ہے۔ افراط و تفریط بہت زیادہ ہے اگر خیال نہیں تو بڑی بڑی معصیتوں کا اور بدعتوں کا نہیں ہوتا اور خیال ہوتا ہے تو مباح تک پر ہاتھ صاف کرنے کو اور اس کو معصیت میں داخل کرنے کو تیار ہیں ۔"
>
> افاضات الیومیہ : ص ۳۱۳

اب یہی دیکھ لیجیے کہ سارے علماء حدیث ضعیف ہونے کے باوجود انگوٹھے چومنے کو مستحب ہی کہتے ہیں اور ان حضرات کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی پر انگوٹھے چومنا معصیت معلوم دیتا ہے تو کیا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کا فرمودہ ان پر حرف بہ حرف ثابت نہیں ہوتا !

چلیے اب آپ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب ؒ کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمالیجیے ۔

سوال چھوڑ دیا گیا ہے ۔

جواب

> "انگوٹھے چومنے اور آنکھوں سے لگانے کی کوئی صحیح دلیل نہیں ہے اس لیے اس کو شرعی حکم سمجھ کر کرنا نہیں چاہیے ۔ بعض لوگ اس

کو بطور عمل کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس عمل سے آنکھیں دکھنے سے محفوظ رہتی ہیں تو اس نیت سے کرنا مباح ہے مگر نہ کرنے والوں پر کوئی مواخذہ والزام بھی نہیں "

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ (کفایۃ المفتی: ج نہم: ص ۲۵۲)

ایک روایت یہ بھی سُنی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ آشوب چشم ہو گیا تو آپؓ نے ایسے ہی انگوٹھے چوم کر اس کا علاج کیا تھا۔ اس روایت کا ذکر ایک مرتبہ ہماری مجلس میں ہوا تو ایک صاحب نے پوچھا: کیا آنکھیں دکھتی نہ ہوں تو بھی انگوٹھے چومنا مستحب و مباح ہے؟ میں نے عرض کیا تھا، کیوں نہیں میں نے اپنے اساتذہ سے سُنا ہے کہ آنکھیں دکھنا جسمانی مرض ہے تو بدنگاہی روحانی مرض ہے تو انگوٹھے چومنا دونوں بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے۔ یوں بھی فقہا اس کو ہر حالت میں مستحب بتایا ہے اس لئے کہ اس عمل کو آنکھیں دکھنے کے ساتھ مقید نہیں کیا ہے۔ مزید تائید کے لئے صاحب "نصاب اہلِ خدمات شرعیہ" کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیے:

"پہلی مرتبہ اشہدان محمد ارسول اللہ سُن کر صلی اللہ علیک یارسول اللہ بھی کہنا اور دوسری مرتبہ سُن کر اپنے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو آنکھوں پر رکھ کر قرۃ عینی بک یارسول اللہ اللّٰھم متعنی بالسمع والبصر کہنا مستحب ہے۔

نصاب اہل خدمات شرعیہ: حصہ اول: ص ۸۶

اب آپ آخیر میں اذان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر انگوٹھے چومنے سے متعلق صاحب "تفسیر روح البیان" جیسی عظیم شخصیت کا بیان بھی پڑھ لیں:

> "یقول الفقیر قد صح عن العلماء تجویز الاخذ بالحدیث الضعیف فی العملیات فکون حدیث المذکور غیر مرفوع لا تستلزم ترك العمل بمضمونه وقد اصاب القهستانی فی القول ماستحبابه" (تفسیر روح البیان: الجزء الثالث: سورۃ الاحزاب: ص۱۵)
>
> ترجمہ: فقیر کہتا ہے کہ علمائے کرام سے یہ بات صحت کے درجے کو پہنچ چکی ہے کہ عملیات میں حدیثِ ضعیف پر عمل کرنا جائز ہے تو حدیثِ مذکور کا غیر مرفوع ہونا، اس کے مضمون پر عمل کرنے کو ترک کرنے کو مستلزم نہیں ہے۔ قہستانی نے انگوٹھے چومنے کو مستحب کہا ہے تو درست کہا ہے۔

چوٹی کے علمائے کرام اور فقہائے عظام کے ان سارے فتووں کا ماحصل یہی ہے کہ اذان میں اشہد ان محمد الرسول اللہ سن کر انگوٹھے چومنا مستحب ہے اگر کسی نے نہ چومنے میں احتیاط بتائی ہے بھی تو اس کے وجوہات دوسرے ہیں۔ لہذا ہمیں ان فرمودات پر عمل پیرا ہو کر آپس میں لڑنے کی خو چھوڑ دینی چاہیے۔ اب جن حضرات کو اس عمل میں زحمت معلوم ہوتی ہو یا اور کوئی مصلحت ہو تو نہ کریں۔ لیکن کرنے والوں پر لعن طعن نہ کریں۔ اللھم اھدنا الی الصراط المستقیم

حضرت قطبِ ویلور رح اس پر بحث کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

> "حاصل کلام اذان میں اشہد ان محمدا رسول اللہ پر انگوٹھے چومنے کے بارے میں سند موجود ہے اگرچہ ضعیف ہی کیوں نہ ہو"
>
> فصل الخطاب: صـ ۱۱۱
>
> الحدیث ـــــ سنہ ۱۴۰۶

شریعت نامی کتاب میں حضرت مولانا ارشد القادری صاحب پالن حقانی صاحب کے ایک سوال کے جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> "حنفی مذہب کی کتابوں کا پھر سے مطالعہ کیجئے اور سچے جذبے کے ساتھ یہ معلوم کیجئے کہ حضور پاک ؐ کا نام سن کر انگوٹھا چومنے کے سلسلہ میں احناف کا صحیح مذہب کیا ہے؟ یہ دیکھئے حنفی مذہب کی معتبر کتاب شامی میں اس مسئلہ کی تفصیل یوں لکھی ہوئی ہے:
>
> "مستحب یہ ہے کہ اذان میں پہلی بار حضورؐ کا نام سن کر یہ درود شریف پڑھے صلّی اللہ علیك یارسول اللہ اور دوسری بار کہے قرّۃ اعینی بك یارسول اللہ اس کے بعد دونوں انگوٹھے آنکھوں پر رکھ کر یہ دعا پڑھے: اللّٰھم متّعنِی بالسمع والبصر جو شخص ایسا کرے گا اور کہے گا اس کے لیے حضورؐ نے بشارت دی ہے کہ قیامت کے دن جنّت کی طرف اس کی پیشوائی کروں گا جیسا کہ کنز العباد میں یہ حدیث منقول ہے۔" (شامی ج ۱: باب الاذان: صـ ۲۹۳

حقانی صاحب حنفی مذہب میں حضور پاکؐ کا نام سن کر انگوٹھا چومنے کا صحیح طریقہ یہ ہے اور اسی طریقے کے ہم پابند ہیں۔ اس درود شریف پڑھنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ اب تو شاید آپ یہ سوال نہیں کریں گے کہ انگوٹھا چومنا چاہیئے یا درود شریف پڑھنا چاہیئے۔ علمائے احناف کہتے ہیں کہ دونوں کو کرنا چاہیئے اور دونوں میں کوئی منافات نہیں کہ چومنا لبوں کا کام ہے اور پڑھنا لبوں کا کام ہے۔"

شریعت: ص ۶۲

میں سمجھتا ہوں کہ مسئلہ کی حقیقت کو سمجھنے کے لیئے مذکور معروضات کافی ہیں۔

پگڑی کے ساتھ نماز

ہمارے بعض پڑھے لکھے دین دار بھائیوں کو ہی نہیں بلکہ بعض علماء کو بھی بلا عمامہ ٹوپی کے ساتھ ہی نماز پڑھانے پر اصرار ہے اور وہ کسی کی سننے کے لیے تیار بھی نہیں ہیں۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ خود کو عالم اور پگڑی کے ساتھ نماز پڑھانے والوں کو اپنے زعم باطل میں جاہل بھی سمجھتے ہیں۔ لہذا اس موضوع پہ مختلف مفتیانِ کرام کے فتاوی کو ایک جگہ جمع کردینا مناسب معلوم ہوا، تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے۔

سب سے پہلے آپ دار العلوم دیوبند کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں:

سوال

ٹوپی اوڑھ کر امامت بلا کراہت جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"ٹوپی سے امامت درست ہے کچھ کراہت نہیں ہے۔ البتہ عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا اور امامت کرنا افضل ہے اور ثواب زیادہ ہے۔ لیکن ٹوپی بھی مکروہ نہیں ہے۔"

فتاوی دار العلوم: ج ۴: ص ۹۷

مذکورہ فتوے سے یہ تو معلوم ہوگیا کہ " ٹوپی سے امامت درست ہے"
لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ٹوپی کے ساتھ ہی نماز پڑھاتے رہیں۔ اگر یہی مطلب ہوتا تو حضرت مفتی صاحب ہرگز یہ جملے نہیں لکھتے " البتہ عمامہ کے ساتھ نماز پڑھنا اور امامت کرنا افضل ہے اور ثواب زیادہ ہے " اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ٹوپی سے امامت افضل ہونے اور اس میں ثواب زیادہ ہونے پر کسی بھی دارالافتاء کا سہی ایک فتوے بھی پیش نہ کرسکیں گے، برخلاف پگڑی سے امامت افضل ہونے اور اس میں ثواب زیادہ ہونے پر سب متفق ہیں۔

اور ایک فتویٰ ملاحظہ فرمائیے :

سوال

امام کو ٹوپی سے نماز پڑھانا جائز ہے یا عمامہ سے، اگر ٹوپی سے نماز پڑھانا جائز ہو تو وہ کون سی ٹوپی ہے ؟ عمامہ اور ٹوپی میں ثواب کس کے ساتھ نماز پڑھانے میں زیادہ ہے ؟

جواب

" امامت عمامہ اور ٹوپی دونوں سے جائز ہے اور کسی خاص قسم کی ٹوپی سے ضروری نہیں۔ جس ٹوپی سے چاہے امامت کرسکتا ہے۔ عمامہ کے ساتھ ثواب زیادہ ہوگا۔ لیکن ٹوپی میں کوئی کراہت بھی نہیں ہے "

کفایۃ المفتی: ج ۳: ص ۲۷

مذکورہ فتوے میں بھی عمامہ کے ساتھ "ثواب زیادہ ہوگا" نوٹ کرلیجیے اور آگے بڑھیئے۔ بعض حضرات اس وہم میں ہیں کہ ٹوپی پر رومال یا تولیہ باندھنا

پگڑی نہیں ہے۔ اپنے بچاؤ کی صورت پیدا کر لینے کے لیے دینی علوم سے ناواقف لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ یہ رومال اور تولیہ باندھنا بھی پگڑی کے حکم میں نہیں تو وہ بھی ٹوپی سے پڑھاتے ہیں اور ہم بھی پھر دونوں میں فرق کیا رہا۔ اس وہم سے پیچھا چھڑانے کے لیے دارالعلوم کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ اگر خلوص ہو تو اسی دن سے آپ پگڑی باندھنے لگیں گے۔

سوال

تولیہ یا رومال بجائے عمامہ کے باندھ کر نماز پڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اور تولیہ ٹوپی پر باندھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اور اس سے نماز پڑھنا مکروہ ہے یا نہیں؟ اور یہ اعتجار ہے یا نہیں؟ اگر کوئی شخص اس پر طعن کرنے اور الفاظِ جاہلانہ توہین کے کہے تو اس کو عتاب ہونا چاہیے یا نہیں؟

الجواب

"تولیہ اور رومال ..... ٹوپی پر باندھنا مکروہ نہیں ہے۔ یعنی عمامہ کے طور پر باندھنا اور نماز اس سے مکروہ نہ ہوگی بلکہ اطلاق عمامہ کا اس پر آئے گا۔ اور باندھنے والا مستحق ثواب ہوگا اور یہ اعتجار مکروہ نہیں ہے۔ عصابہ بمعنی عمامہ بھی آتا ہے اور پٹی جو سر پہ باندھی جائے اس کو بھی عصابہ کہتے ہیں۔ العصابۃ تاتی بمعنی العمامۃ کما فی القاموس و شرح الشمائل للقاری عمامۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت منقول ہے کہ آپ کے پاس دو عمامے تھے۔ ایک سات ذراع کا اور ایک بارہ ذراع کا۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ اس میں کوئی تحدید شرعاً نہیں ہے۔ بقدر ضرورت ہونا کافی

کافی ہے۔ 'جمع الوسائل شرح الشمائل للعلی القاری' میں ہے

وقال الشیخ الجزری فی تصحیح المصابیح تتبعت الکتب وتطلبت من السیر والتواریخ لاقف علی قدر عمامة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلم اقف حتی اخبرنی من اثق بہ انہ وقف علی شیٔ من کلام النووی ذکر فیہ انہ کان لہ صلی اللہ علیہ وسلم عمامة قصیرة وعمامة طویلہ وان القصیرة کانت سبعة اذرع مطلقاً من غیر تقیید بالقصیر والطویل الخ فقط

فتاوٰی دارالعلوم: ج ۴: ص ۹۴

ٹوپی پر رومال باندھنے کو جو بھائی اپنی لاعلمی کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہوں اور اس کو پگڑی نہ سمجھتے ہوں دارالعلوم کے فتوے کا یہ جملہ نوٹ کرلیں "باندھنے والا مستحق ثواب ہوگا" ہمارے خیال میں رومال کو پگڑی ہونے سے انکار کرنے والوں کے ذہن میں شاید پگڑی کا ٹھیک سات ہاتھ ہونا شرعاً ضروری ہے تو انھیں حضرت مفتیٔ دارالعلوم دیوبند کا یہ جملہ بھی نوٹ کرلینا چاہیے "اس میں تحدید شرعاً نہیں ہے" اور اگر وہ کتب فقہ کا مطالعہ کریں تو انھیں علم ہوگا کہ فقہائے کرام نے پگڑی کی تعریف لفٌ واحدٌ سے کی ہے۔ یعنی ایک پیچ کا نام پگڑی ہے۔

اور بعض حضرت جو ٹوپی کے ساتھ نماز پڑھاتے ہیں، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ پگڑی کیوں نہیں باندھتے تو بڑے ہی دھوکے کا جواب دیتے ہیں: کہتے ہیں کہ لوگ امام کے پگڑی باندھنے کو ضروری اور واجب سمجھتے

ہیں اس لیے میں پگڑی نہیں باندھتا تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو۔

چلیے حضرت مولانا تھانویؒ کا جواب پڑھ لیجیے تو آپ کو پتہ چلے گا کہ ایسا جواب دینے والے حضرات لوگوں کی غلط فہمی کو دُور کرتے ہیں یا انھیں غلط فہمیوں میں ڈالتے ہیں:

سوال

اگر کسی کا یہ خیال ہو کہ نماز میں عمامہ کو ضروری خیال کر لیا گیا اور ایسا ضروری نہیں ہے اور وہ اسی وجہ سے عمامہ موجود ہوتے ہوئے نہیں باندھتا ہو تو اس کا یہ فعل بُرا ہے یا نہیں؟

الجواب

"گاہ گاہ ہو تو بُرا نہیں۔ نظیرہ فی ردالمحتار فی تعیین السور فان ایہام اللزوم ینتفی بالترک احیاناً"

امداد الفتاوی جدید: ج ۱ : ص ۳۹۲

اس جواب سے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی رائے صاف ظاہر ہے کہ کبھی کبھی عمامہ کے بغیر نماز پڑھائیں تو برا نہیں ہے۔ اکثر عمامہ ترک کرنا برا ہے۔ اب کوئی صاحب ہمیشہ عمامہ کے بغیر ہی نماز پڑھانے پہ اصرار کریں تو بہت برا ہونا چاہیے اس لیے کہ امام کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اپنی نماز کے ساتھ مقتدیوں کے نماز کے ثواب میں بھی کمی کا سبب بن جائے۔

افسوس ہے کہ ہم لوگ دنیوی تجارت میں دنیا بٹورنے کے لیے

ایک نئے پیسے کا بھی گھاٹا برداشت نہ کریں اور اُخروی تجارت کے ذریعہ ثواب بینک بیلنس کرنے سے اس درجہ بے پروہ ہوں، سارے فقہی کتابیں سارے فقہاے کرام اور تمام مفتیان کہتے ہی رہیں کہ پگڑی کے ساتھ نماز افضل ہے پگڑی کے ساتھ ثواب زیادہ ہوگا۔ تاہم ہٹ دھرمی اور دنیوی مفاد پرستی کا یہ عالم بڑے بڑوں کو خاطر میں نہیں لایا جاتا۔ صرف اس لیے کہ ہم اپنی سُستی یا بے علمی سے بلا عمامہ نماز پڑھانے کے عادی ہو گئے ہیں اور اب پگڑی باندھنا شروع کریں تو ہتک عزّت ہوگی یا اسی میں ہماری دنیوی منفعت ہے۔ شاید ہم اسی لیے دُہرائے جا رہے ہیں کہ پگڑی کے بغیر فقط ٹوپی کے ساتھ بھی نماز جائز ہے۔ نماز کے جائز ہونے کا کسے انکار ہے۔ نماز تو ننگے سر سے بھی ہو جاتی ہے۔ صرف ناف سے گھٹنوں تک ایک لنگی باندھ لیں بقیہ پورا جسم ننگا ہو تو بھی نماز ہو جاتی ہے۔ بحث فضیلت اور ثواب کی ہے۔ ساری عبادتیں ثواب کے لیے تو کی جا رہی ہیں۔

اب ہمیں اس بات کا بھی جائزہ لینا بہت ضروری ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کبھی بلا عمامہ نماز پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ یہ جاننے کے لیے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح کی فتاوی رشیدیہ کا یہ سوال وجواب پڑھ لیں:

سوال

سرورِ عالم ؐ سے کبھی بلا عمامہ کے بھی نماز پڑھنا ثابت ہے یا نہیں؟ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بلا عذر نماز بلا جماعت بھی پڑھی ہے یا نہیں؟

الجواب

"اس کا صریح ثبوت بندے کو اس وقت معلوم نہیں مگر احرام کی حالت میں سر برہنہ نماز پڑھنا محقق ہے علیٰ ھذا نماز فرض مرض الموت میں بلا جماعت پڑھی ہو۔ ورنہ جماعت سے ہی پڑھتے تھے۔"

فتاویٰ رشیدیہ: ص ٦٨

اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ پگڑی سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ اس لیے کہ بلا عمامہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نماز پڑھنے کا ثبوت حضرت مولانا کے پاس نہیں ہے۔ اگر ثبوت نہیں ہے تو پھر ہم بلا عمامہ نماز پڑھ کر ثواب کیوں کھولیں!

اب یہ بھی معلوم کرلیں کہ پگڑی کے ساتھ دو رکعت نماز کا ثواب بلا عمامہ والی نماز کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ ہے۔ حضرت مولانا عبد الحق محدث دہلوی رح نے "شرح سفر السعادت" میں لکھا ہے کہ:

"دو رکعت بعمامہ بہتر است از ہفتاد رکعت بے عمامہ"

یعنی: پگڑی کے ساتھ دو رکعت بہتر ہیں پگڑی کے بغیر ستّر رکعت نماز سے۔

سفر السعادت: ص ٤٣

اس کے ساتھ آپ علامہ انور شاہ کشمیریؒ کا وہ بیان بھی پڑھ لیں لکھتے ہیں کہ "میرے پاس تحقیق شدہ بات یہ ہے کہ ان شہروں میں جہاں پگڑی کو شئے محترم سمجھا جاتا ہو پگڑی کے بغیر نماز پڑھانا مکروہ ہے"۔ والمحقق عندی انھا تکرہ فی البلاد التی تعد فیھا شیئاً محترما

فیض الباری: ج ۲: ص ۸۰

پگڑی باندھنا مستحب ہونے تک نماز مکروہ نہ ہوتی تھی۔ اب علامہ انور شاہ صاحب کے بلند نظریہ میں بات اور اونچی ہوگئی ہے۔ اب آپ ہی فیصلہ فرمالیں کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔

آئیے! اب یہ بات بھی معلوم کرلیں کہ اگر امام صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھائے تو فقط امام ہی اس فضیلت سے محروم رہے گا جو صافہ باندھ کر نماز پڑھنے میں ہے یا مقتدیوں کو بھی امام کی ٹوپی کے سبب ثواب کم ملے گا۔ (مقتدی خواہ صافہ باندھے ہو یا ٹوپی پہنے ہو؟) اس سوال کا جواب حضرت مولانا گنگوہی سے سن لیجیے۔

الجواب (۲)

"جب یہ فضیلت امام ہی کو حاصل نہیں ہوئی مقتدیوں کو کہاں سے حاصل ہوگی۔ ہاں! اگر مقتدی نے خود عمامہ باندھ کر نماز پڑھی ہے تو اپنے عمامہ کی افضلیت اس کو حاصل ہوگی اگر امام عمامہ باندھے گا تو اس کی افضلیت بھی اس کو حاصل ہوگی واللہ سبحانہ تعالی اعلم: حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہ"

فتاوی محمودیہ: ج ۷: ص ۱۴۲

اس فتوے کو پڑھیئے اور بار بار پڑھیئے پھر اس کے بعد سوچیئے کہ حضرت گنگوہی رح اور دوسرے علمائے کرام و مفتیان عظام کے فتوؤں کے مدنظر صرف ٹوپی پہن کر نماز پڑھانے والے ائمہ مساجد کیا اپنے مقتدیوں پر شرعًا وعقلاً زیادتی نہیں کر رہے ہیں ؟

اللہ تعالیٰ ہم سب کی ہدایت فرمائے اور اخلاص کی دولت سے مالا مال کر دے — آمین !!

○

فرض نماز کے بعد جہراً دعا کرنا

آج بھی فرض نمازوں کے بعد دُعا ہندوستان میں خصوصًا جنوبی ہند میں جہرًا ہی کی جارہی ہے۔ مسلمانوں کا مسلسل عمل یہی ہے الّا ماشاءَ اللہ ادھر سال دو سال سے احناف ہی کی اکا دکا مساجد میں فرض نمازوں کے بعد سکوت چھا گیا ہے۔ جن شہروں میں یہ عمل کیا جارہا ہے وہاں کے علما سے محققین احقر کے پچاس سالہ مشاہدہ میں جہرًا ہی دعا کرتے آئے ہیں اور انھیں شہروں کی بقیہ تمام مساجد میں آج بھی دعا جہرًا ہی حسبِ عادت جاری ہے۔

حیرت کا مقام ہے کہ اسلام کو آئے ہوئے چودہ سو سال سے زیادہ ہو گئے، مگر ان حضرات کو ادھر دو سال کے اندر ہی اندر علم ہوا ہے کہ دعا جہرًا نہیں سرًا کرنا ہے۔

ہماری حالت دیکھتے ہوئے شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ اثبات وجود یا اور کوئی گہری بات تو نہیں ہے ؟

ہماری نیت ہمارا کام بزرگوں اور مفتیان عظام کے آرا و فتاوی پیش کر کے مسلمان بھائیوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنا اور آپس کے تعصب، اختلاف و تشتت سے بچانے کی جد و جہد کرنا اور دعا کرنا ہے اور بس!

اب آپ جہرًا دعا کے سلسلہ میں سب سے پہلے جنوب کے سب سے بڑے مدرسہ باقیات صالحات، ویلور کے مدرسِ اول حضرت مولانا عبدالقادر بادشاہ صاحب کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے:

مسئلہ: "بلند آواز سے ذکر و دعا کرنے کے باب میں بہ سبب اختلاف ادلّہ کے علمائے کے اقوال مختلف ہیں۔ چناں چہ بعض احادیث میں آیا ہے، حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قرآنِ شریف پڑھتے وقت اور جنازہ لے جاتے وقت اور جنگ کے وقت، نصیحت کرتے وقت آواز بلند کرنے کو مکروہ جانتے تھے۔ حالاں کہ اذان و وعظ و خطبۂ جمعہ و خطبۂ عیدین و خطبۂ حج وغیرہ میں بلند آواز سے پڑھنا ثابت ہے۔ مگر فتاویٰ خیریہ میں اس تعارض کی یوں توفیق کی ہے: یہ حکم اشخاص و احوال و اوقات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے۔ یعنی جہاں ریا سمعہ کا گمان ہو یا نماز پڑھنے والے کو ایذا ہو یا سونے کو تکلیف ہو اس وقت دعا و ذکر سرًا ہی افضل ہے۔ اور جہاں ان شبہات کی گنجائش نہ ہو دعا و ذکر جہرًا افضل ہے۔ کیوں کہ جہر کرنا دعا و ذکر کا ازروئے عمل کے اکثر ہے اور اس کا فائدہ غیر تک اثر کرتا ہے اور ذاکر کے دل کو ہشیار کرتا ہے، اونگھنے کی نیند کو بھگاتا ہے۔ دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔"

الباقیات الصالحات: ص ۱۰۱

حضرت محترم نے احادیثِ شریفہ کی روشنی میں معتدل رائے پیش فرمائی ہے اور آپ کا رجحان جہراً دعا ہی کی جانب ہے۔

چلیئے اب آپ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسے دارالعلوم دیوبند کے موجودہ مفتیانِ کرام کا جواب بھی پڑھ لیجئے:

سوال

نماز کے بعد جہراً دُعا کرنا کیسا ہے؟

المستفتی: محمد طیب غفرلہٗ سہارن پوری، مقیم بنگلور

الجواب

"وباللہ التوفیق! دُعا آہستہ مانگنا چاہیے یہی افضل ہے بقول علیہ السلام خیر الذکر الخفی نیز جہراً بھی جائز ہے اور حدیث سے اس کا ثبوت ملتا ہے: عن ابن الزبیر کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا سلم من صلاتہ قال بصوتہ الاعلی لاالٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ

طحطاوی علی المراقی: ص ۱۷۰

العبد نظام الدین	الجواب صحیح
۹ـــــــــــ۱ـــــــــ ھ ۱۴۰۷	ظفیرالدین مفتی دارالعلوم

فتویٰ میں ذکرکردہ حدیث خیر الذکر الخفی (یعنی بہترین ذکر ذکر خفی ہے) کو مطلق معنوں میں لیا جائے تو پھر ذکر سری افضل ٹھہرے گا حالاں کہ سارے صوفیائے کرام، علمائے عظام ذکرِ جہری کرتے ہیں۔ کسی نے بھی ذکرِ جہری کو مفضول اور ذکرِ سری

کو افضل بتاکر ذکرِ جہری سے اعراض نہیں کیا ہے۔ اعراض کرنا تو بہت دور کی بات ہے بلکہ اس سوال پر کہ ذکرِ جہری سے ریا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو کیا کریں کے جواب میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں :

> "ذکرِ جہر سے اگر ریا پیدا ہو تو اس کے رفع کے واسطے لاحول بکثرت پڑھا کریں۔ مگر اس کے لیئے ترک جہر مناسب نہیں ہے۔"
>
> فتاویٰ رشیدیہ : حصۂ سوم : ص ۱۰۵

آپ ہی سوچیئے کہ آج کے ان سائیکلوں، سائیکل موٹروں، موٹروں اور اسپیکروں سے نت نئے ہنگاموں کے دور میں ذکرِ جہری اور دعائے جہری کو ترک کر کے یہ سوچنا کہ دعائے سری اور ذکرِ سری میں یکسوئی پیدا ہو گی ؟ دل کو سرور حاصل ہوگا ؟ وہم کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ جس پر میرا ہی نہیں آپ سب کا بھی تجربہ شاہد ہے۔ اس کے برخلاف علمائے کرام کہتے ہیں کہ یکسوئی اور دل کا قرار ذکرِ جہری و دعائے جہر میں ہے۔ جیساکہ حضرت مولانا عبدالقادر صاحبؒ نے اپنے فتوے میں ارشاد فرمایا ہے۔ اسی طرح کسی فائدہ کے مدِّنظر ہی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ریا پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو بھی ذکر جہری کو ترک کر دینے کا مشورہ نہیں دیا بلکہ لاحول پڑھنے فرمایا ہے۔ اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ بات آئے کہ دعائے جہری اور ذکرِ جہری کی اجازت دینے والے علماء کرام نے حدیث کی مخالفت نہیں کی ہے بلکہ جہر والی حدیث کو ایک قید سے مقید کر کے اس پر عمل کر رہے ہیں۔

چناں چہ امام شعرانیؒ فرماتے ہیں اجمع العلماء خلفا وسلفا علی استحباب ذکر الجماعۃ فی المساجد الّا ان یشوش جہرھم علی نائم او مصل او قاری۔۔ الخ (ردالمحتار) یعنی مسجدوں میں ایک جماعت کا ذکر کرنا مستحب ہونے پر سلفا و خلفا علماء کا اجماع ہے۔ اگر ان کا یہ ذکرِ جہری سونے والے کو یا نمازی کو یا قرآنِ مجید پڑھنے والے کو پریشان نہ کردے۔ نیز سر وہاں افضل ہوگا جہاں جہر میں ریا پیدا ہوتا ہو اس کا جواب حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے جو دیا ہے آپ پڑھ چکے ہیں۔

یوں بھی ذکرِ سری خود ریا کے امکان سے بچا ہوا نہیں ہے۔ کوئی شخص آنکھ بند کرکے چپ چاپ بیٹھ جائے تو خود ذاکر اور دیکھنے والے یہ سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت عرش پر پہنچ چکے ہیں۔ بہرحال چوں کہ ذکر اور دعا بعد نماز دونوں میں جہر و اخفا کی بحث تھی۔ ملی جلی پیش کردی گئی۔

حضرت مولانا عبدالحق محدثؒ دہلوی "شرحِ سفر السعادتؒ" میں لکھتے ہیں:

> "جہر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم برائے تعلیم بود اگر جائے دیگر نیز امام را مصلحت در جہر و اعلان بود بقصدِ تعلیم اعلام بکند درست است بلکہ مستحسن۔
>
> شرحِ سفر السعادت: ص ۱۱۱
>
> ترجمہ: آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جہراً دعا کرنا تعلیم کے لیے تھا اور اگر دوسرے مقام پر بھی امام جہراً دعا کرنے میں مصلحت سمجھے تو

تعلیم کے لیے جہرًا دعا کرے تو درست ہے بلکہ مستحسن ہے۔"

ظاہر ہے کہ دعائی تعلیم کی ضرورت کسی وقت اور کسی زمانے میں بھی منتفی ہوئی ہے اور نہ منتفی ہوگی۔ لہٰذا دعائے جہری مستحسن ہے۔ نیز دعا میں جہر اس درجہ نہیں ہوتا کہ جس سے نمازیوں کی نماز وغیرہ میں خلل ہو۔ معتدل ہی ہوتا ہے۔ جیسا کہ آپ کا اور تمام کا مشاہدہ ہے۔

اب آپ اخیر میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی کا بیان پڑھ لیں جو ولا تجہر بصلاتک والی آیت کے تفسیری حاشیہ پر موجود ہے:

"ولا تجہر بصلاتک ولا تخافت بہا وابتغ بین ذالک سبیلا (سورۂ کہف)

ترجمہ: اور پکار کر مت پڑھ اپنی نماز اور نہ چپکے پڑھ اور ڈھونڈ لے اس کے بیچ کی راہ:

حاشیہ: یعنی جہری نماز میں (اور اسی طرح دعا وغیرہ میں) بہت زیادہ چلّانا بھی نہیں اور بالکل دبی آواز بھی نہیں۔ بیچ کی چال پسند ہے۔" (موضح القرآن)

حضرت مولانا کا یہ بیان پڑھ کر ہمارے ان بھائیوں کو اخلاص کے ساتھ سوچنا چاہیئے جو دعائے جہری کو ناجائز سمجھ کر ادھر چند سالوں سے وہ بھی اکا دکا ہی

سری دعا شروع کر بیٹھے ہیں اور اس طرح خواہ مخواہ مسلمانوں میں انتشار کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ آیا یہ لوگ دعائے جہری و سری میں فیصلہ پہ پہنچنے کے لیئے حضرت مولانا عبدالقادر بادشاہ باقویؒ ویلوری، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا عبدالحق دہلویؒ سے بڑھ کر کس پر تکیہ کئے ہوئے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو فروعی مسائل میں انتشار و اختلاف سے محفوظ رکھے۔ آمین!

ذکرِ جہری پہ مولانا گنگوہیؒ کا فتویٰ آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب نماز کے بعد جہری دعا کرنے سے متعلق بھی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا فتویٰ پڑھ لیں۔

مسئلہ سوم

فرضوں کے بعد دعا جہر سے مانگنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

بعد فرض نماز کے دعا جہر سے کرنا جائز ہے۔ اگر کوئی مانع عارض نہ ہو۔ فقط : فتاوی رشیدیہ : ج ۲ : ص ۱۲۵

○

دعا میں ہاتھ اٹھانا

دعا میں ہاتھ اٹھانا احادیثِ شریفہ سے مطلقاً ثابت ہے۔ خواہ دعا بعد نماز ہو، دکان یا فیکٹری کی افتتاح کے وقت ہو، مجلسِ نکاح میں ہو یا اور کسی بھی تقریب میں ہو۔ چناں چہ حدیثِ شریف ہے: عن السائب بن یزید عن ابیہ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا دعا رفع یدیہ مسح وجہہ (رواہ ابوداؤد) ترجمہ: سائب بن یزید اپنے باپ یزید سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی دعا فرماتے اپنے دستہائے مبارک بلند فرماتے اور (اختتامِ دعا پر) اپنے چہرۂ مبارک پر پھیر لیتے۔ ابوداؤد کی حدیث آپ کے سامنے ہے۔ اس میں یہ قید کہاں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف نماز کی دعا میں فقط دستِ مبارک اٹھاتے تھے۔ دوسری تقریبوں میں نہیں۔ جب یہ قید نہیں ہے تو معلوم ہوا کہ ہر دعا میں ہاتھ اٹھاتے تھے۔ رہی یہ بحث کہ دعا میں کہاں تک ہاتھ اٹھائیں۔ تو اس کا جواب آپ درج ذیل حدیث سے معلوم کر لے سکتے ہیں۔ عن ابن عباسؓ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال المسئلۃ ان ترفع یدیک حذو منکبیک او نحوھما (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ دُعا میں تم اپنے دونوں ہاتھ اپنے دونوں مونڈھوں تک یا اس سے قریب اٹھاؤ اسی لیے علمائے کرام نے دُعا میں ہاتھ سینے یا مونڈھوں تک کے مقابل رکھنے کا حکم دیا ہے۔ 'حصن حصین' مشہور اور معتبر کتاب ہے۔ اس میں ہے کہ ان من آداب الدعاء رفع یدین (حصن حصین) ترجمہ: دُعا کے آداب میں سے ایک رفع یدین بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں ہاتھ نہ اٹھانا بے ادبی ہے۔ دعا میں مطلقاً ہاتھ اٹھانے پر اور بھی کئی احادیثِ شریفہ ہیں۔ اگر کسی کو اس کا انکار ہو اور یہ دعویٰ ہو کہ نکاح کی مجلس میں دعا اور دوسری تقریبوں میں دُعا پر ہاتھ اٹھانا منع ہے تو وہ براہ کرم منع پر حدیث پیش کریں۔ ہم اسی آن اپنے دعوے سے معافی کے ساتھ رجوع کرلیں گے۔

اب یہی دیکھیے کہ جلیل القدر علماء کرام میّت کے اہلِ خانہ کی تعزیت ادا کرنے کے وقت دُعا کے لیے ہاتھ اٹھانا جائز بتایا ہے۔ حالاں کہ تعزیت کے وقت والی دُعا میں خاص طور پر ہاتھ اٹھانا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ چناں چہ مسائل اربعین میں حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب لکھتے ہیں:

> دست برداشتن برائے دعا وقتِ تعزیت ظاہر آں جواز است زیرا کہ حدیثِ شریف رفع یدین در دُعا مطلقاً ثابت شدہ۔ پس دراین وقت ہم مضائقہ نہ دارد ولیکن تخصیص آن برائے دُعا وقت تعزیت ماثور نیست۔
>
> (مسائل اربعین)

تعزیت کے وقت دُعا کے لئے ہاتھ اٹھانا ظاہراً جائز ہے اس لیے کہ دُعا میں رفع یدین والی حدیث مطلقاً ثابت ہے۔ پس تعزیت کے وقت بھی مضائقہ نہیں ہے لیکن تعزیت ادا کرنے کے وقت میں خاص طور پر ہاتھ اٹھانا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ حضرت مولانا نے تعزیت کے وقت ہاتھ اٹھانا جائز بتا کر دلیل بھی پیش کی ہے کہ دُعا میں رفع یدین والی حدیث مطلقاً ثابت ہے۔ اس سے مزید ایک بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ یہاں ہاتھ اٹھانے سے فقہائے کرام نے بھی نہیں روکا ہے۔ ورنہ حضرتِ موصوف ہرگز اجازت نہیں دیتے۔

جنازہ کی نماز کے بعد دعا سے متعلق حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ لکھتے ہیں:

> "اور دفن سے واپس ہوتے وقت التزام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا یا جنازہ کی نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دُعا مانگنا یہ سب رواج و رسم ہے۔ خفیہ بلا التزام مضائقہ نہیں ہے۔"
>
> مجالس الحکمہ: ص ۲۱۸

حضرت محترم نے مذکور عبارت میں یہ جملہ "ہاتھ اُٹھا کر دُعا مانگنا" دو مرتبہ استعمال فرمایا ہے اور پھر اسی ہیئت پر نمازِ جنازہ کے بعد دُعا کرنے کو "مُضائقہ نہیں ہے" فرمایا ہے، یہ نہیں فرمایا: کہ جنازہ کی نماز کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دُعا کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ لہٰذا منع ہے۔ ظاہر ہے کہ ہاتھ اٹھانے کو اس

لیے منع نہیں فرمایا کہ دُعا میں ہاتھ اٹھانا مطلقاً ثابت ہے۔ ناجائز کیسے کہتے ؟ پھر یوں بھی آپ کا روئے سخن نماز جنازہ کے بعد کی دُعا کی طرف ہے، نہ کہ دعا میں ہاتھ اٹھانے کی طرف۔ وہ تو جائز ہی ہے۔!

اب آپ چلتے چلتے دارالعلوم دیوبند اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیں:

سوال

بعدِ اذان رفع یدین کرکے مناجات کرنا ثابت ہے یا نہیں ؟

الجواب

"خصوصیت کے ساتھ اس موقع پر رفع یدین ثابت نہیں ہے اگرچہ عموماً دعا میں رفع یدین کا مستحب ہونا اس کے استحباب کو بھی مقتضی ہے، مگر معمول نہیں ہے۔

فتاوی دارالعلوم: ج ۲: ص ۱۱۰

مطلب یہ ہوا کہ جہاں کہیں بھی دُعا میں ہاتھ اٹھانا خاص طور پر حدیث سے ثابت نہ ہو وہاں بھی مطلق والی حدیث کو دلیل بنا کر ہاتھ اٹھا کر دُعا کرنا مستحب ہو گا۔

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

الجواب

"اذان کے بعد جو الفاظ ادا کئے جاتے ہیں وہ دُعا کے الفاظ ہیں اور رفع یدین آداب دعا میں سے ہے، اس لیے ہاتھ اٹھانے

میں مضائقہ نہیں ہے"
کفایۃ المفتی: ج ۳: ص ۸

ان سارے دلائل کے باوجود بعض ہمارے بھائیوں کو نکاح کی مجلس ہی میں نہیں بلکہ پنجگانہ نمازوں کی دعاؤں میں بھی ہاتھ اٹھاتے ہوئے شرم معلوم ہوتی ہے۔ غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے شرمانا چاہیے اور بعض بھائی ہاتھ اٹھانے کے آداب سے واقف نہیں ہیں انہیں جاننے والوں سے پوچھ کر معلوم کرلینا چاہیے۔ حدیث شریف میں دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو پھیلا کر دعا مانگنا آیا ہے اذا سالتم اللہ فاسئلوہ ببطون اکفکم (مشکوٰۃ شریف) یہ لوگ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھک لیتے ہیں یا ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنسا کر سینے کے سامنے رکھ لیتے ہیں یا دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو ایسا جوڑ لیتے ہیں جیسے دنڈوت کر رہے ہوں۔ حالاں کہ حدیث شریف میں ہے: قبلۃ الدعاء السماء دعا کا قبلہ آسمان ہے یعنی دعا کے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کا رخ آسمان کی طرف ہونا چاہیے اور دونوں ہتھیلیوں کے کناروں کو ملالینا بھی نہیں چاہیئے بلکہ دونوں ہتھیلیوں کے کناروں کے درمیان ذرا سا فاصلہ ہونا چاہیے۔ یہ ہیں آداب دعا۔!

جمعہ کا خطبہ عصا کے ساتھ

ہمیں یہ سوچ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ جب ہمارے پاس اختلافی مسائل میں بھی ایک ایسا نقطہ ایک ایسا مرکز، ایک پلاٹ فارم الحمدللہ موجود ہے جس پر ہم سب جمع ہو کر اطمینان کی سانس لے سکتے ہیں تو پھر ہم جمع کیوں نہیں ہوتے؟ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ بعض حضرات جمعہ کا خطبہ دینے منبر پر بغیر عصا کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاید وہ عوام الناس کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سارے وہ خطیب جو عصا کے سہارے سے خطبہ دیتے ہیں حدیث جانتے نہیں ہیں۔ مسئلہ سے واقف نہیں ہیں۔ بس میں ایک ہی اعلم الناس ہوں اور وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ خود حدیث سے نابلد ہیں اور مسلمانوں میں اختلاف کے بیج بو رہے ہیں اور قیامت کے دن انھیں اس کی جواب دہی کرنی ہے۔

اب آپ سب سے پہلے اس سوال کا جواب معلوم کر لیجئے کہ منبر پر جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عصا پر سہارا دے کر خطبہ پڑھنا ثابت نہیں تو پھر عصا کے سہارے خطبہ پڑھنا سنّت کیسے ہوا؟

الجواب

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاٹھی پر سہارا دے کر خطبہ پڑھا

تو سُنّت ہوگیا کسی چیز کے سُنّت ہونے کے لیئے مواظبت شرط نہیں اور جس سنّت پر ہمیشگی ہو وہ سنّتِ مؤکدہ ہوجاتی ہے۔"

کتبہ رشید احمد

الجواب صحیح : عزیز الرحمٰن عفی عنہ

یہی نہیں باقیات صالحات کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا شیخ آدم شیخ پیر رح کا فتوی بھی خطبۂ جمعہ میں عصا کا سہارا لینا سنت ہونے کا ہی ہے۔ سوال وجواب پڑھ لیجئے:

سوال

خطبۂ جمعہ وعیدین میں خطیب کا عصا کا سہارا لینا ضروری ہے یا نہیں؟ کون سا امر ہے، عادت ہے یا عبادت ہے؟

الجواب

"جمعہ وعیدین میں خطیب کا عصا پکڑنا سنّت ہے۔ جیسا کہ دُرِ المختار میں ہے۔ نقل القهستانی عن المحیط ان اخذ العصا سنۃ: انتہی: جلد اول ص ۵۷۷

فتاوی شیخنا: دفتر فتاوی: ص ۴۵

بانیٔ باقیات صالحات سے لے کر تمام اساتذہ مدرسہ باقیات صالحات کا عمل بھی یہی رہا ہے۔

کسی صاحب کو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے فتوی میں شک

واقع ہوگیا کہ خطیب خطبہ کے وقت عصا کا سہارا لے یا نہیں تو انھوں نے سوال کیا سوال وجواب دونوں ملاحظہ فرمائیے۔

سوال

الخطب الماثورہ میں مذکور ہے کہ امام خطبہ کے وقت عصا ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو اور بہشتی زیور سے ممانعت مفہوم ہے۔ فکیف التوفیق وعلی ایّ القولین العمل؟

الجواب

"درمختار" میں قوس یا عصا پر سہارا لگانے کو مکروہ کہا ہے اور "ردالمحتار" میں اس پر دو اشکال کئے ہیں ایک ابوداؤد کی روایت سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عصا یا قوس کا سہارا لیا ہے دوسرا محیط کی روایت سے کہ اخذ عصا کو سنّت کہا ہے مثل قیام کے۔ ج ۱: ص ۸۶۲ اور ترجیح ردالمحتار کے قول کو ہے۔ پس بہشتی زیور میں گو اس مسئلہ کا ہونا بعید ہے۔ اس لیے کہ اس میں احکام مختصہ بالرجال نہیں لیے گئے۔ لیکن اگر ایسا ہے تو غالباً درمختار کی روایت کی بنا پر لکھ دیا گیا ہوگا۔ جس کا مرجوح ہونا ابھی معلوم ہوا۔"

امداد الفتاوی: ج اول جدید: ص ۶۸۱

دیکھ رہے ہیں آپ حضرت مولانا جیسی شخصیت لکھتی ہے "جس کا مرجوح ہونا ابھی معلوم ہوا" مطلب یہ کہ اگر ہم نے بہشتی زیور میں عصا لینے کو ممنوع لکھا بھی ہو تو وہ مرجوح ہے اور عصا لینا راجح اور مسنون ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ خطبہ میں عصا لینا سنّت ہونے پر انھیں چار علمائے کرام کے فتاوی کافی سے زائد ہیں۔ تاہم حضرت مولانا محمود الحسن گنگوہیؒ کا یہ فتویٰ پڑھ لیجئے:

سوال

جمعہ کا خطبہ پڑھتے وقت لاٹھی لینا سنّت ہے یا واجب؟

الجواب

"حامداً ومصلیاً واجب نہیں سنّت (غیر موکدہ) ہے۔ ویکرہ ان یتکأ علی قوس او عصا: درمختار: قال الشامی: متوکأ علی عصا او قوس ونقل القهستانی عن المحیط ان اخذ العصا سنته (ردالمحتار: ج ۱: ص ۸۶۴) فقط واللہ سبحانہٗ تعالیٰ اعلم

حررہ العبد محمود گنگوہی عفا اللہ عنہٗ۔ فتاوی محمودیہ: ج ۷: ص ۲۷

○

جمعہ میں اذانِ ثانی کے بعد دُعا

جمعہ میں اذان ثانی کے بعد دعا کرنا کیا ہے؟ جاننے سے پیشتر یہ معلوم کر لیجئے کہ مسجد میں اذان کا جواب دینا کیا ہے! اس کے لیئے مندرجہ ذیل سوال و جواب پڑھ لیجئے:

سوال

اذان و قامت کا جواب دینا سامع پر واجب ہے مگر جو شخص حاضرِ مسجد ہے اس پر اذان کا جواب دینا واجب نہیں ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب

"اذان و اقامت کا جواب مستحب ہے۔ بعض علماء جوابِ اذان کو واجب کہتے ہیں مگر زیادہ معتمد یہی ہے کہ اجابت فعلی (اذان سُن کر مسجد کی طرف جانا) واجب ہے۔ اجابتِ قولی (اذان سن کر منہ سے اس کا جواب دینا مستحب ہے۔ فقط واللہ اعلم بالصواب

فتاویٰ رحیمیہ: ج ۱: ص ۱۳۵

مذکورفتوی سے معلوم ہوا کہ مسجد میں بھی اذان کا جواب دینا مستحب ہے۔ لیکن بعض لوگوں کی شان ہی عجیب ہوتی ہے کہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے مسجد

میں اذان کا جواب دینا ناجائز سمجھتے ہیں۔ خود بارگاہِ الٰہی میں دعا سے محروم ہو جاتے ہیں اور طرفہ تماشا یہ کہ دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔

اب آپ جمعہ کی اذانِ ثانی کے بعد دعا سے متعلق درج ذیل سوال و جواب پڑھ لیجیے۔

سوال

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ جمعہ کے خطبے کی اذان کے بعد اذان کی دعا کرنا درست ہے یا نہیں؟ اگر درست نہیں تو فقہ و حدیث کے دلائل سے آگاہ فرمائیں، عین نوازش ہوگی۔ جو لوگ اس کی ممانعت کرتے ہیں، انہیں کیسے سمجھائیں۔

سائل محمد یحییٰ۔ سرکاپل پیٹ

الجواب

"وھو الموفق للصواب: خطیب کے روبرو جو اذان دی جاتی ہے اس کا جواب دینا اور دعا مانگنا مکروہ نہیں ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت معاویہ رضؓ کے عمل کا ذکر ہے اور اذان کے بعد دعائے وسیلہ کا ثبوت ہے جو اس کے منکر ہیں ان پر لازم ہے کہ اپنے انکار پر سند پیش کریں۔ دعا کا ثبوت 'عمدۃ الرعایہ' میں موجود ہے:

فلا تکرہ اجابۃ الاذان الذی یوذن بین ید الخطیب وقد ثبت ذالک من فعل معاویہ رضؓ فی صحیح البخاری ودعاء الوسیلۃ الماثورۃ بعد ذالک الاذان۔ (عمدۃ الرعایہ)

واللہ تعالیٰ اعلم

کتبہ عبدالوہاب عفی عنہ
الجواب صحیح ناکارہ شبیہ احمد قاسمی فیض آبادی
دفتر فتاوی: غیر مطبوعہ: جمادی الآخر ۱۴۰۲ھ

اس سے معلوم ہوا کہ
خطیب صاحب کے منبر پر بیٹھ جانے کے بعد اُن کے روبرو اذان ثانی جو دی جاتی ہے اس کی دعا کرنا جائز ہے۔ اس پر لے دے کرنا بیکار ہے اس لیئے کہ حضرت امیر معاویہؓ نے خود دعا فرمائی ہے اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھانا تو مطلقاً ثابت ہے۔

○

دو خطبوں کے درمیان دعا

سوال جمعہ میں دو خطبوں کے درمیان دعا کرنا کیسا ہے؟

الجواب

" دو خطبوں کے مابین تین آیت پڑھنے کی مقدار خطیب کا بیٹھنا توارثاً ثابت ہے۔ جیسا کہ 'ھدایہ' میں ہے: یخطب خطبتین یفصل بینھما بقعدۃ بہ جری التوارث انتہی اور خطیب خطبہ شروع کرنے کے آگے تسبیح، ذکر قرأت جائز ہے اور خطبہ میں بمقدار ثلاث آیات بیٹھنے کے وقت سے نماز ادا کئے جانے کے وقت تک دعا مقبول ہونے کا وقت ہے کہ کئی صحیح حدیثوں میں آیا ہے۔ اس لیے اس وقت امام دعا کرنا منع نہ ہوگا چناں چہ "مفتاح الصلاۃ" میں ہے۔ 'باید دانست چون در وقت سکوت امام یعنی ما قبل از شروع تسبیح، ذکر و قرأت بروایت صحیحہ برآمدہ کہ ساعۃ ما بین ان یجلس الامام فی الخطبۃ الی ان تقضی الصلاۃ کما صح فی صحیح المسلم و جزم امام النووی فی شرح المسلم

وقال هو الصواب پس باید کہ در وقت جلوس کہ در ظاہر الروایۃ مقدار سہ آیت وارد است کما فی التجنیس وغیرہ: ربنا آتنا الخ: برعایت معنی بخواند کہ عمل بر ظاہر الروایۃ واحادیث صحیحہ واقع گردد واگر دست برداشتہ بخواند موافقت طریقۂ دعا کہ در احادیث است واقع گردد عمل بزرگان نیز ہست۔ انتہی۔

فقط واللہ اعلم کتبہ شیخ آدم عفی عنہ

مدرس مدرسۂ باقیات صالحات ویلور

ترجمہ: جاننا چاہیے کہ امام کے سکوت کے وقت یعنی تسبیح ذکر وقرأت شروع کرنے سے آگے صحیح روایات میں آیا ہے کہ دعا کی قبولیت کا وقت خطبہ میں امام کے بیٹھنے کے وقت سے نماز کے ادا کئے جانے کے وقت تک ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے اور شرح مسلم میں امام نووی رح نے یقین کے ساتھ ذکر فرمایا ہے اور کہا ہے کہ یہی درست ہے۔

پس چاہیے کہ امام کے بیٹھنے پر جس کی مقدار ظاہر الروایۃ میں تین آیت شریفہ کی قرأت کی مقدار روایت کی گئی ہے۔ جیسا کہ تجنیس وغیرہ میں ہے ربنا آتنا الخ معنی کی رعایت کے ساتھ پڑھیں تو یہ ظاہر الروایۃ اور احادیث صحیحہ پر عمل ہوگا اور اگر ہاتھ اٹھا کر دعا کرے تو دعا کے اس طریقہ کے موافق ہوگا جو احادیث میں موجود ہے اور بزرگوں کا عمل بھی ہے۔ انتہی فقط واللہ اعلم

کتبہ شیخ آدم عفی عنہ

الجواب صحیح
ضیاء الدین محمد کان اللہ لہ

الجواب صحیح
عبد الرحیم عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد عبد الصمد عفی عنہ

واصاب من اجاب
محمد عبد العلی عفی عنہ

الجواب صحیح
محمد حسن بادشاہ عفی عنہ

الجواب صحیح
ضیاء الدین احمد آمانی عفی عنہ

صح الجواب واللہ اعلم بالصواب
محمد سعید کان اللہ لہ

الجواب صواب
محمد غوث غفرلہ ولوالدیہ

الجواب صحیح
محمد ابراہیم عفی عنہ

۷ مارچ ۱۹۳۷ء کو روانہ کیا گیا۔

حضرت مفتی صاحب نے فرمایا ہے کہ خطبہ میں امام کے بیٹھنے کے وقت سے نماز کے ادا کئے جانے کے وقت تک قبولیت دعا کا وقت ہے اور یہ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے اور اس فتوی پر الحمد للہ متبحر اور اپنے وقت کے مانے ہوئے استاذ الاساتذہ کے دستخط ہیں۔ پھر ہم اس وقت دعا نہ کر کے خسارہ میں کیوں پڑ جائیں۔

بعض حضرات اس دعا کے ہی قائل نہیں ہیں، بعض قائل ہیں بھی تو اس وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان حضرات کا شبہ مذکور فتوے میں صاحبِ "مفتاح الصلاۃ" کی وضاحت سے دور ہو جانا چاہیے۔ مزید وضاحت شرح صدر کی ضرورت ہو تو حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب کا یہ فتوے بھی پڑھ لیجیے۔ جو انھوں نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد لکھا ہے:

بالجملہ خلاصۂ کلام یہ کہ دعائے مذکور خطیب کے لیے مطلقاً اور سامعین کے لیے دل میں باتفاق جائز اور مذہب امام شافعی رح

وقول امام ابویوسفؒ پر ان کے لیے زبان سے بھی قطعاً اجازت ہے اور ارشادِ امام اعظمؒ کی ایک تخریج پر کردہ دوسری پر جائز ائمہ فتویٰ نے دونوں کی تصحیح کی تو احد التصحیحین دعائے مذکور امام و مقتدی سب کو دل وزبان ہر طرح سے باتفاق مذہبین حنفی وشافعی مطلقاً جائز و مشروع اور علماء تصریح فرماتے ہیں کہ جب ترجیح مختلف منکانی ہو تو مکلف کو اختیار ہے کہ ان میں سے جس پر چاہے عمل کرے اصلا محل انکار و اعتراض نہیں۔ "بحر الرائق" و "درمختار" وغیرہما میں ہے متی کان فی مسئلۃ قولان مصححان جاز القضاء والافتاء باحدھما لہٰذا فقیر غفراللہ تعالیٰ باآنکہ یہاں تصحیح تبیین کو ارجح جانتا ہے ہمیشہ سامعین کو بین الخطبتین دعا کرتے دیکھا۔ اور کبھی منع نہیں کرتا ہے۔ ھذا جملۃ القول فی ھذا الباب والتفصیل فی فتاوٰنا بعون الوہاب

فتاویٰ رضویہ : ج ۳ : ص ۷۸۸

اب آپ ہی بتائیے کہ مذکور فتاریٰ کی رو سے دل اور زبان دونوں میں جس سے چاہے ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جائز ہو اور محلِ انکار نہ ہو تو پھر اس پر تشدد برتنے فتنہ مچانے اور گروہ بندی کی آخر ضرورت کیا ہے ؟

خطبہ جمعہ کی زبان

جمعہ کا خطبہ غیر عربی میں جائز ہونے یا نہ ہونے سے متعلق معلومات حاصل کرنے سے پہلے سورۃ الجمعہ کی اس آیتِ شریفہ "فاسعوا الی ذکر اللہ" میں ذکر کے معنے کیا ہیں معلوم کیجیے۔ تفسیر ابی السعود میں ذکر کے معنے خطبہ اور نماز دونوں بتائے گئے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں: فاسعوا الی ذکر اللہ ای امشوا واقصدوا الی الخطبۃ والصلاۃ (تفسیر ابی السعود) علامہ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں ذکر کے معنی خطبہ بتائے ہیں۔ لکھتے ہیں: الذکر الخطبۃ اور صاحبِ "مقاصد القرآن" نے اپنی کتاب میں ذکر کے معنے نمازِ جمعہ اور خطبہ دونوں بتاتے ہیں پھر ترجیح بھی بتائی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے:

> "والمراد من ذکر اللہ ھنا صلوٰۃ الجمعۃ وقیل موعظۃ الامام والاول اولی قال الجمھور الخطبۃ وبہ استدل ابوحنیفہؒ علی ان الخطبۃ اذا اقتصر علی الحمد للہ جاز (مقاصد القرآن: ص ۵۶۴) **ترجمہ: یہاں ذکر اللہ سے جمعہ کی نماز مراد ہے اور ایک قول میں کہا گیا ہے کہ امام کی نصیحت ہے۔ پہلا**

قول اولیٰ ہے اور جمہور علماء نے کہا ہے کہ ذکر سے مراد خطبۂ جمعہ ہے۔ اسی قول سے امام ابوحنیفہؒ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ اگر خطیب "الحمد للہ" پر اختصار کر لے بھی تو خطبہ جائز ہے۔"

اس سے معلوم ہوا امام اعظمؒ کے پاس بھی ذکر سے مراد خطبہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہؒ نے خطبۂ جمعہ بتمامہا عربی میں ہونے کی شرط نہیں لگائی ہے آپ کے پاس خطبہ غیر عربی میں بھی بلا کراہت جائز ہے۔ چناں چہ "شرحِ سفر السعادت" میں ہے۔

"افضل است کہ خطبہ بزبانِ عربی باشد و نزد ابی حنیفہؒ بہ غیر عربی نیز جائز است بہ ہر زبانے کہ باشد۔"

(شرحِ سفر السعادت از شیخ عبدالحق محدثؒ دہلوی)

ترجمہ: افضل یہ ہے کہ خطبہ عربی زبان میں ہو اور ابوحنیفہؒ کے پاس غیر عربی میں بھی جائز ہے۔ کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہو۔

امام اعظمؒ کے پاس یہ جواز عربی پر قدرت ہونے کے باوجود بھی ہے۔ (البتہ صاحبین کے نزدیک عربی عبارت ہونا شرط ہے۔ لیکن عربی سے عاجز ہونے کی صورت میں ان کے ہاں بھی غیر عربی میں بھی جائز ہے۔

مانعین کہتے ہیں کہ امام اعظمؒ نے صاحبین کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے لیکن مجوزین جواب دیتے ہیں کہ آپ کا رجوع کرنا قرأۃ فارسی میں ثابت ہے دوسرے اذکار خطبہ وغیرہ میں ثابت نہیں جیسا کہ ردالمحتار میں ہے۔

میں ہے:

"جعل العینی الشروع کالقرأۃ لاسلف له فیه ولا سند له یقویه" (ردالمحتار: المجلد الاول: ص ۴۸۴)

یعنی عینی کا فارسی زبان میں نماز کی ابتدا کرنے اور خطبہ پڑھنے وغیرہ کو نماز میں قرآن مجید پڑھنے جیسا بتانے پر سلف میں سے کسی کا بھی قول اس کی تائید نہیں کرتا اور نہ ہی ان کے اس قول کی تائید کرنے والی کوئی سند ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فارسی زبان میں نماز شروع کرنا خطبہ پڑھنا جائز ہے۔ خواہ عربی زبان سے عاجز ہوں یا نہ ہوں اور امام اعظمؒ کا رجوع نماز میں فارسی زبان میں قرأت کرنے کے متعلق ثابت ہے دوسرے اذکار خطبہ وغیرہ میں رجوع کرنے کی کوئی سند نہیں ہے۔

نیز فتاوی سراجیہ میں ہے "ولو خطب بالفارسیة تجوز" یعنی اگر خطیب فارسی میں خطبہ دے تو جائز ہے۔ اور 'مراقی الفلاح' میں ہے "الرابع الخطبة ولو بالفارسیة من قادر علی العربیة" یعنی چوتھی چیز خطبہ ہے خواہ فارسی زبان میں ہو عربی زبان پر قدرت رکھنے والے ہی کیوں نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ اگر فارسی زبان میں خطبہ دینے سے بھی امام اعظمؒ کا رجوع ثابت ہوتا تو صاحبِ 'سراجیہ' اور صاحب 'مراقی الفلاح' فارسی میں خطبہ جائز نہیں بتاتے۔

مانعین کہتے ہیں کہ اگر ہم آج خطبہ جمعہ غیر عربی میں پڑھنے کی اجازت

دے دیں تو کل کلاں کو لوگ نماز بھی غیر عربی میں پڑھ لینے کا مطالبہ کریں گے۔

مجوزین: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ اتنی سی بات امام ابوحنیفہؒ کو معلوم نہیں تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ آپ کا یہ قیاس، قیاس مع الفارق اس لیے کہ اللہ تعالےٰ نے قرآن پاک کو خالص عربی زبان میں نازل فرمایا ہے اور اسی کا نام قرآن ہے، ترجمہ کا نام نہیں۔ اس لیئے اس کا بعینہٖ نماز میں پڑھنا بالاجماع فرض ہے۔ خواہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ چناں چہ قرآن پاک میں ہے: انا انزلناہٗ قرآناً عربیاً۔ (بے شک ہم نے اس کو عربی قرآن اتارا ہے) لیکن خطبۂ جمعہ کے لیئے عربی زبان ہی ہونا شرط نہیں ہے۔ اور امام اعظمؒ کے پاس خطبہ غیر عربی میں بھی جائز ہے، جیسا کہ آپ شرح سفر السعادت میں پڑھ چکے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ خطبہ وعظ ونصیحت ہے۔ جیسا کہ مسلم شریف کی حدیث میں ہے: عن جابر بن سمرۃ قال کان لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبتان یجلس بینھما یقرء القرآن و یذکر النّاس فکانت صلواتہ قصداً و خطبتہ قصداً۔ (رواہ المسلم)

یعنی جابر بن سمرہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو خطبے ہوا کرتے تھے آپؐ ان دونوں کے درمیان بیٹھتے تھے قرآن پڑھتے تھے اور لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے۔ آپ کی نماز بھی درمیانی ہوتی تھی اور خطبہ بھی درمیانی ہوتا تھا۔ (رواہ مسلم)

حدیث شریف میں لفظ یذکر استعمال ہوا ہے اس کے معنے لغۃً بھی حدیث کے سیاق وسباق سے بھی "نصیحت کرتے تھے" ہی ہیں۔ چناں چہ بذل المجھود فی حل ابوداؤد میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے بھی یذکر الناس

کی تشریح یعظھم (لوگوں کو نصیحت کرتے تھے۔) سے کی ہے۔

نیز علامہ ابن قیم اپنی کتاب "زاد المعاد" کی جلد دوم میں خصائص جمعہ کے تحت لکھتے ہیں:

> "بائیسویں خصوصیت یہ ہے کہ اس دن خطبہ پڑھا جاتا ہے۔ جس میں خدا کی حمد و ثنا، توحید و رسالت کی شہادت ہوتی ہے لوگوں کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اور ان چیزوں کا امر ہوتا ہے جو خدا سے قریب کردیں۔ اور ان چیزوں سے منع کیا جاتا ہے جو خدا کی ناراضگی کا سبب بنتی ہیں۔ غرض خطبہ سے یہی مقصود ہے۔"
>
> زاد المعاد: ج دوم۔

کھلی بات ہے کہ سامعین کو خدا سے قریب کرنے والی چیزوں کا حکم دینا اور خدا سے دور کرنے والی چیزوں سے منع کرنا اسی وقت مفید اور معقول ہو سکتا ہے، جب سامعین خطبہ کی زبان سے واقف ہوں اور علامہ عینی چھٹویں جلد میں "باب یستقبل الامام القوم واستقبال الناس الامام" یعنی یہ باب امام کے قوم کی طرف اور قوم کا امام کی طرف رُخ کرنے کے بیان میں ہے۔ کے تحت لکھتے ہیں:

> "لان یتفرغوا لسماع الموعظۃ وتدبر کلامہ؛
>
> ترجمہ: تاکہ سامعین خطبہ سننے اور خطیب کے کلام میں تدبر

کرنے کے لیے پوری طرح تیار رہیں۔"

اور صاحب "کفایہ" لکھتے ہیں:

"لو خطب قاعدا او علی غیر طهارة اجزاه لحصول المقصود وهو الوعظ والتذکیر۔
ترجمہ: اگر خطیب بیٹھ کر یا طہارت کے بغیر ہی خطبہ دے تو خطبہ جائز ہو جائے گا۔ مقصود کے حاصل ہو جانے کی وجہ سے اور خطبہ سے مقصود وعظ و تذکیر ہے۔"

اب یہ بھی پڑھ لیجیے کہ صاحب "ھدایہ" عید کے خطبہ کا مقصد کیا بتاتے ہیں:

"و یخطب بعد الصلاة خطبتین یعلم الناس فیها صدقة الفطر و احکامها لانها شرعت لاجله
ترجمہ: اور خطیب نماز کے بعد دو خطبے پڑھے گا اور اس میں لوگوں کو صدقۂ فطر اور اس کے احکام کی تعلیم دے گا۔ اس لیے کہ خطبہ اسی کے لیے شروع ہوا ہے۔"

آپ اوپر پڑھتے آئے ہیں کہ مسلم شریف کی حدیث میں یذکر الناس والے

جملے کے معنے از روئے لغت "لوگوں کو نصیحت کرتے تھے" ہی ہیں اور علامہ عینی اور علامہ ابن قیم نے بھی وہی معنی بتائے ہیں! اور صاحب کفایہ اور صاحب ہدایہ نے تو خطبہ کا مقصود ہی وعظ و نصیحت بنا دیا ہے۔ یہی نہیں تمام فقہائے کرام نے خطبۂ جمعہ کی پندرہ سنّتوں میں سے ایک سنّت لوگوں کو نصیحت کرنا بتائی ہے تو کم از کم مجھ جیسے طالب علم کے ذہن میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ خطیب اور سامعین کی زبان ایک نہ ہو تو نصیحت کیوں کر سمجھ میں آئے گی؟ اور یہ سنّت کیوں کر ادا ہوگی نیز اگر خطبۂ جمعہ سے پند و نصیحت کو کوئی تعلق ہی نہ ہوتا اور خطبہ صرف ذکر ہی ذکر ہوتا تو حسبِ ضرورت موقع بہ موقع نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ عالیہ علاحدہ علاحدہ نہیں ہوتے بلکہ اذان اور دیگر تسبیحات و اذکار کی طرح متعین الفاظ اور جملوں پر مرتب ہوتے اور ساری دنیا کے خطیب منبروں پر انھیں متعین الفاظ کو دہراتے ہوتے۔

اب یہ بھی پڑھیے کہ "بہارِ شریعت" میں حضرت مولانا اعظمی رضوی صاحب لکھتے ہیں:

"مسئلہ: عیدالفطر کے خطبے میں صدقۂ فطر کے احکام کی تعلیم کرے وہ پانچ باتیں ہیں:۔ (۱) کس پر واجب ہے؟ (۲) اور کس کے لیے (۳) اور کب؟ (۴) اور کتنا؟ (۵) اور کس چیز سے بلکہ مناسب یہ ہے کہ عید سے پہلے جو جمعہ پڑھے اس میں بھی یہ احکام بتا دیے جائیں کہ پیشتر سے لوگ واقف ہو جائیں اور عیدالاضحیٰ کے خطبے میں قربانی کے احکام اور تکبیراتِ تشریق کی تعلیم کی جائے۔" درمختار، عالمگیری، بہارِ شریعت ج ۴ ص ۸

مذکورہ فتوے میں حضرت اعظمی صاحب نے درمختار اور عالمگیری کے حوالے سے عیدالفطر کے خطبے میں صدقۂ فطر کے احکام اور عیدالاضحیٰ میں قربانی کے احکام کی تعلیم دینے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیم وتعلّم کے لئے معلّم اور متعلم دونوں کی زبان ایک ہونا ضروری ہے۔

اب غیر عربی میں ترجمہ کرنے سے متعلق فتاویٰ اشرفیہ کا درج ذیل سوال وجواب پڑھ لیجئے:

السوال

ما قولکم رحمکم اللہ ربکم اندرین مسئلہ کہ جمعہ کے خطبوں کے درمیان یا آخر بطور وعظ خطبہ کا ترجمہ کر دینا جائز ہے یا نہیں؟

الجواب

"جائز ہے۔ ھکذا یستفاد من العالمگیریہ۔ واللہ اعلم"

فتاوی اشرفیہ: حصہ اول: ص ۳۸

اس پر کسی صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ ہونے پر شبہ کا اظہار کیا اور آپ سے حقیقت دریافت کی تو آپ نے لکھا:

"فتویٰ میرا ہی ہے ابتدائی دور کا ہے مجمل، اس کی تفصیل میں اتنا اور بڑھا دیا ہے "ایسا کرنا گاہ گاہ کسی ضرورت سے قلیل مقدار سے مضائقہ نہیں"

النور: ص ۶۱: ذیقعدہ ۴۹ھ

حضرت محترم نے خطبہ کا ترجمہ قلیل مقدار میں کرنا مضائقہ نہیں
فرمایا ہے۔ درحقیقت آپ نے ابوداؤد کی اس حدیث شریف کی طرف اشارہ
فرمایا ہے: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایطیل الموعظہ یوم الجمعۃ
یعنی جمعہ کے دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم طول طویل نصیحت نہیں فرماتے تھے۔

بہرحال ہم مذکور مضبوط دلائل کی روشنی میں سامعین کی زبان میں
مختصر خطبہ کے ذریعہ احکاماتِ خداوندی اور ارشادات نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کو جمعہ میں ایک مرتبہ عوام الناس تک پہنچانے کے زرّین موقع سے فائدہ کیوں نہ
اٹھائیں۔ ہمیں دکھ ہوتا ہے کہ بعض حضرات مطلقاً میلاد شریف کو بدعت اور
خطبۂ جمعہ کو غیر عربی میں ناجائز بتا کر مسلمان بھائیوں کے اصلاح کے دو اہم
دروازے بند کردیں تو پھر اصلاح کا وہ کون سا عام ذریعہ ہے ہماری سمجھ میں نہیں
آتا۔ اس پر ہمارے بھائی مانعین کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ
تابعین اور تبع تابعین سے کسی نے بھی خطبۂ جمعہ غیر عربی میں ارشاد نہیں فرمایا
ہے لہذا مکروہِ تحریمی ہے۔ اس کے جواب میں مجوزین کہتے ہیں اگر اس کو
قاعدۂ کلّیہ بنا لیا جائے تو ہر وہ دینی کام جس کو نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم صحابۂ کرامؓ
تابعین اور تبع تابعین نے نہ کیا ہو مکروہ تحریمی ہونا چاہیئے۔ چناں چہ نماز
کی نیت زبان سے کرنا حدیث سے ثابت نہیں ہے نہ صحابہؓ نے کیا ہے نہ
تابعین اور تبع تابعین نے اس لیئے کہ نیت دل کا کام ہے زبان کا نہیں تو پھر
اس کو بھی مکروہِ تحریمی ہونا چاہیئے (حالاں کہ یہ ہمارے ہاں مستحب ہے) اس لیئے
کہ جب علّت دونوں جگہ ایک ہو تو معلول بھی ایک ہونا چاہیئے۔ (جیسے جہاں
جہاں آفتاب طلوع ہوگا وہاں وہاں دن موجود ہوگا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہمارے

ہاں آفتاب طلوع ہو تو دن موجود ہو اور آپ کے ہاں آفتاب طلوع ہونے کے باوجود گھپ اندھیری رات ہی رہے۔

مانعین اس کے جواب میں کہتے ہیں زبان سے نماز کی نیت کرنا متاخرین فقہائے کرام سے ثابت ہے۔

مجوزین: اس کا جواب دیتے ہیں کہ غیر عربی میں خطبہ دینے کا جواز بھی متاخرین تو متاخرین ہی ہیں امام اعظمؒ سے ہی ثابت ہے۔ نیز احادیث شریفہ میں اس کی جانب اشارے بھی ملتے ہیں۔ چناں چہ ابوداؤد نے باب رفع الیدین علی المنبر کے تحت ایک حدیث ذکر کی ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اثنائے خطبۂ جمعہ میں انگشتِ شہادت سے اشارہ فرمایا کرتے تھے، عام طور پر ایسا اشارہ سامعین کی تنبیہ کے لیے ہوا کرتا ہے۔ اگر سامعین کو بات سمجھانا مقصود نہ ہو تو تنبیہ کیسی؟ اور بات سمجھنے اور سمجھانے کے لئے متکلم اور سامع کی زبان ایک ہونا چاہیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ذکر سے مراد محض ذکر نہیں موعظت و نصیحت بھی ہے۔ جیسا کہ کئی مفسرین و فقہائے کرام نے اس کی تشریح فرمائی ہے۔

امام شعرانیؒ نے اذانِ جمعہ کے بعد تجارت کرنا جائز ہے یا ناجائز پر اختلافِ مسلک بتاتے ہوئے دلوں کو چھو لینی والی بات بتائی ہے:

"والوجه الثاني الاخذ بالاحتياط حيث ان غالب الناس يشتغل بالكلام عن الله تعالى فيفوته سماع مايعظه به الخطيب على لسانه تعالى و يفوته معنى الذى لاجله شرعت الخطبة و

وهو جمعية القلب على الله تعالىٰ بذالك الوعظ والتذكير فان الخطبة دهليز لدخول حضرة الله تعالىٰ ومن لم يسمعها لم يحصل له قوة استعداد يدخل به حضرة الله تعالىٰ في خطبة الجمعة ۔" میزان الشعرانی: ج ۱: ص ۱۶۹

ترجمہ: دوسری وجہ احتیاط کو اختیار کرنا ہے اس لیے کہ اکثر لوگ گفتگو میں مشغول ہو کر اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتے ہیں اور وہ خطیب کا خطبہ سننے سے محروم ہو جاتے ہیں جو کلام اللہ پر مشتمل ہوتا ہے اور وہ اس روح کو کھو بیٹھتے ہیں جس کے لیے خطبہ شروع ہوا ہے اور وہ روح وعظ وتذکیر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دل جمعی کا نام ہے ۔ اس لیے کہ خطبہ بارگاہِ الٰہی میں داخلہ کے لیے دہلیز کا کام دیتا ہے اور جو شخص جمعہ کا خطبہ نہیں سُنے گا اس کے اندر بارگاہِ الٰہی میں داخلہ کی قوتِ استعداد پیدا نہیں ہوگی ۔

امام شعرانیؒ نے یہی تو بتایا ہے کہ دین کی باتیں سننے سے دل کو تقویت ہوتی ہے اور دل پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سکنیت کا نزول ہوتا ہے ۔ اس کیفیت کے ساتھ آدمی خطبۂ جمعہ ختم ہوتے ہی نماز میں مشغول ہو جاتا ہے تو نماز میں خشوع و خضوع بڑھ جاتا ہے اور بندہ اللہ سے جڑ جاتا ہے ۔ اب یہ کوئی پوشیدہ راز نہیں ہے کہ یہ کیفیت خطیب کے خطبہ کو سمجھنے کے بغیر پیدا نہ ہوگی ۔ چناں چہ حضرت مولانا عبد الحقؒ دہلوی مسلم شریف کی ایک حدیث کی اس ٹکڑے " واشار با صبعہ المسبحہ " کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

"یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم یک اشارتے بانگشتِ شہادت خود میکرد گویا کہ خطاب میکرد بمردم وتنبیہ می کرد ایشان را براستماع وتامل در آں چہ ذکر میکرد۔"

یعنی آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی انگشتِ شہادت سے ایک اشارہ فرماتے تھے گویا آپؐ لوگوں سے خطاب فرماتے تھے اور جو کچھ آپ ذکر فرماتے تھے اس کو سننے اور اس پر غور وفکر کرنے کے لیے تنبیہ فرماتے تھے۔

اشعۃ اللمعات: جلد اول باب الخطبۃ: ص ۶۳۲

حضرت محدث دہلویؒ کی تشریح واضح ہے کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ہے ہے۔ **مانعین:** اور ایک بات بھی کہتے ہیں کہ خطبۂ جمعہ دو رکعت نماز کے قائم مقام ہے اور جب یہ دو رکعت کے قائم مقام ہے تو اس میں جو کچھ ہوگا عربی زبان ہی میں ہونا چاہیے۔

مجوزین: جواب دیتے ہیں کہ اگر خطبہ جیسا کہ آپ فرمارہے ہیں دو رکعت کے قائم مقام ہے تو خطیب صاحب کی پشت بر قبلہ نہیں رُخ بر قبلہ ہونا چاہیئے۔ حالاں کہ وہ آدابِ خطبہ میں داخل نہیں ہے۔ تو پھر یہ بھی نہیں۔ دوسری بات یہ کہ خطبۂ جمعہ طہارت کے بغیر بھی ہوجاتا ہے۔ فقہائے کرام کہتے ہیں اگر کسی خطیب نے بھول کر خطبہ بغیر وضو کے دے دیا اور پھر خطبہ کے بعد وضو کر کے نماز پڑھا دی تو درست ہے۔ خطبہ دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر نماز کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ بات چیت اور تکلّم سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اگر خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہوتا جیسا کہ مانعین کہتے ہیں تو نماز کی طرح خطبہ بھی فاسد ہو جانا چاہیئے۔ اس کا کوئی بھی قائل نہیں۔ در حقیقت خطبہ کا دو رکعت کے قائم مقام ہونا ثواب اور فضیلت کے اعتبار سے ہے شرائط و آداب کے اعتبار سے نہیں۔

مجوزین کہتے ہیں کہ حدیثِ شریف میں ہے کہ ایک دفعہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ ارشاد فرما رہے تھے اور بعض صحابہؓ مسجد میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: اجلسوا، اجلسوا بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ، تو ایک صحابیؓ مسجد میں داخل ہو رہے تھے اور ابھی اس مقام تک ہی پہنچے تھے جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں۔ بس وہیں بیٹھ گئے۔ مذکور صحابیؓ نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے بعد بھی میں آگے بڑھوں اس حدیث نے خطیب کو اس بات کا اختیار دے دیا ہے کہ سامعین سے اگر کوئی امر خلافِ آدابِ خطبہ صادر ہو تو انھیں ٹوک دیں۔ اب آپ بتائیے کہ خطیب صاحب سامعین کو عربی زبان میں تنبیہ کریں ان کی اپنی زبان میں ؟

مانعین جواب دیتے ہیں یہ دو چار جملے آپ ان کی اپنی زبان میں ہی کہہ لیجیئے۔

مجوزین کہتے ہیں، ہم یہی تو کر رہے ہیں، پھر اعتراض کس بات کا ہے!

اب آپ استاد محترم حضرت مولانا شیخ آدمؒ مفتی باقیات

صالحات، ویلور کا یہ فیصلہ کن بیان بھی پڑھ لیجیے: جواب کا متن اور اس کا ترجمہ دونوں ملاحظہ فرمائیے —!

الجواب

"اختلف العلماء فی ترجمة خطبة الجمعة بلسان الحاضرین هل یجوز بلاکراهتہ ام معها وعلی الثانی هل الکراهیة تحریمیة ام تنزیهیة فمال الی کل واحد من الشقوق فریق منهم وشاع دعوی کل واحد مع الدلائل بصورة الفتاوی والرسائل فمع هذا الاختلاف لاخلاف فی جوازها بالعربیه فقط بلاکراهة کما الاخلاف فی نفس جواز الترجمة من غیر تفصیل فعلی هذا ان لم یکن العادة بالترجمة جاریةً قبل هذا فی ذالك المسجد ینبغی ان یکتفی بها لئلا یحدث الفتنة فی ایجاد امر لم یکن وان کانت مستمرة علی الترجمته فینبغی ایضا ان یترك علی حالها حذرا من وقوع الجدال فی منعه نعم اذا رای الخطیب اثنا الخطبة احدًا ترك معروفا یجوز له امره بلسان التارك فهو بعید من الخطبة کما فی الدر المختار ویکره تکلمه فیها الا لامر معروف لانہ منها انتهی فقط واللّٰه تعالی اعلم

کتبه شیخ آدم عفی عنہ

فتاوی شیخنا: غیر مطبوعہ: ص ۲۶۳

ترجمہ: علماء نے اس بات پر اختلاف کیا ہے کہ حاضرین کی زبان میں جمعہ کے خطبے کا ترجمہ کرنا آیا بلا کراہت جائز ہے یا کراہت کے ساتھ۔ دوسری صورت میں یہ کراہت، کراہتِ تحریمیہ ہے یا تنزیہیہ۔ مذکور شقوں میں سے ہر ایک شق کی طرف ایک فریق کا میلان ہے اور ہر ایک فریق کا دعویٰ دلائل کے ساتھ فتاوی اور رسائل کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ اس اختلاف کے باوجود خطبہ کا فقط عربی زبان میں بلا کراہت جائز ہونے پر کوئی اختلاف نہیں ہے جیسا کہ ترجمہ کرنے کے بلا تفصیل نفسِ جواز میں اختلاف نہیں ہے۔ بنابریں کسی مسجد میں اس سے قبل ترجمہ کرنے کی عادت جاری نہ ہو تو اسی پر اکتفا کر لیں تاکہ ایک غیر جاری امر کے ایجاد کرنے میں فتنہ نہ کھڑا ہو اور اگر ترجمہ کرنے کی عادت جاری ہو تو اس کو بھی اسی حالت پر چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ اس کے منع کرنے میں نزاع واقع ہونے کا اندیشہ ہے۔ ہاں! اگر خطیب نے اثنائے خطبہ میں کسی شخص کو خلاف شرع کوئی حرکت کرتے دیکھے تو خطیب اس شخص کو اسی کی زبان میں امر بالمعروف کر سکتا ہے۔ اور امر بالمعروف خطبہ میں داخل ہے۔ جیسا کہ درالمختار میں ہے ویکرہ تکلمہ فیها الا لامر معروف لانہ منها۔ انتہی: فقط والسلام واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ شیخ آدم عفی عنہ

فتاوی شیخنا: غیر مطبوعہ دفتر: ص ۲۶۳

آپ دیکھ رہے ہیں کس قدر دل نشین اور اختلاف و نزاع کو ختم کرنے والا جواب ہے۔ فتوی کا ماحصل یہی ہے کہ جمعہ کا خطبہ غیر عربی میں بلا کراہت جائز ہے۔ اور عربی میں افضل ہے تو پھر ہمیں آپس میں خواہ مخواہ محاذ آرائی کرنے کی آخر ضرورت کیا ہے؟ اگر کوئی بھائی خدانخواستہ لڑنا لڑانا ہی چاہتے ہوں اور اپنی اونچائی ثابت کرانا چاہتے ہوں تو ہم اُن کے حق میں نیک توفیق کی دعا کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں!

اور آپ نے مذکور تفصیلی بحث سے یہ بات ضرور معلوم کر لی ہوگی کہ تمام مفتیانِ کرام کا رجحان اسی فیصلہ کی طرف ہے۔ چناں چہ حضرت مولانا ابو السعود احمد صاحب باقوی دامت برکاتہم بانی و مہتمم دارالعلوم سبیل الرشاد کا فتوی بھی اسی کی تائید میں ہے۔ فرماتے ہیں:

الجواب

"خطبۂ جمعہ اردو میں بلا کراہت جائز ہے۔ البتہ عربی میں افضل ہے۔ لیکن اذان اول کے بعد منبر کے نیچے ایک اور تقریر کا اضافہ حدیث و فقہ سے ثابت نہیں اس لیئے بدعت ہے اور اس سے اجتناب لازم ہے۔ قال صاحب الفتاوی السراجیہ ولو خطب بالفارسیۃ یجوز فی مراقی الفلاح الخ ....

ماخوذ از سلسبیل: جلد ۷: شمارہ ۱۷: ص۱

دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور

علاوہ ازیں اپنے وقت کے بحر العلوم استاذ الاساتذہ حضرت علّامہ

عبد الجبار صاحب رحمۃ اللہ علیہ صدر المدرسین' باقیات صالحات' ویلور کا فتویٰ بھی یہی ہے اور آپ نے ایک رسالہ بھی مرتب فرمایا ہے۔ مگر اس وقت تفصیل میں جانے اور اس رسالہ کے حوالے پیش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دے تو انشاء اللہ اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا جائے گا۔

بہر حال مجوزین یہی کہتے ہیں کہ خطبۂ جمعہ عربی میں افضل ہے اور اردو میں بلا کراہت جائز ہے تو مانعین پوچھتے ہیں جب آپ عربی میں خطبہ جمعہ کو افضل بتاتے ہیں تو افضل کو ترک کر کے مفضول پر کیوں عمل کر رہے ہیں تو مجوزین جواب دیتے ہیں: یہ عمل ویسا ہی ہے جیسے تراویح میں قرآنِ پاک کے تین ختم کرنا افضل ہے اور ایک ختم کرنا مفضول۔ یہاں بھی ہم افضل کو ترک کر کے مفضول پر ہی تو عمل کرتے ہیں۔ مگر ہر مقام پر افضل کو ترک کرنے کی حکمت فقہائے کرام کے پاس الگ الگ ہے۔ ایسا انہیں مقامات پر کیا جاتا ہے جہاں مفضول پر عمل کرنا شرعاً مفید ہو۔

بس میں اس موضوع پر انہیں چند اہم اور قیمتی معروضات پر بات ختم کر رہا ہوں

وما علینا الا البلاغ

○

عیدین اور نماز جمعہ کے بعد مصافحہ

عیدین، جمعہ اور صبح کی نماز کے بعد مصافحہ ہندوستان میں خصوصًا جنوبِ ہند کی اکثر و بیشتر مساجد میں جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں اختلافات بھی جاری ہے۔

بعض حضرات اس کو سنّتِ مؤکدہ سمجھتے ہیں تو بعض بدعتِ سئیہ و حرام۔ آئیے دیکھیں آخر مفتیانِ کرام کے فتاوی ہماری راہ نمائی کدھر کرتے ہیں ؟

سوال

بعد نمازِ عیدین و جمعہ و پنجگانہ کے مصافحہ کرنا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

" نمازِ عیدین کے بعد مصافحہ یا معانقہ کرنا کوئی شرعی حکم نہیں ہے۔ مصافحہ ابتدائے ملاقات کے وقت سنّت ہے۔ اور اس کا بڑا ثواب ہے۔ مگر عیدین کی نماز کے بعد اس کو ثواب سمجھ کر کرنا بے اصل ہے۔ کفایۃ المفتی: ج ۹: ص ۴۶

جواب کا ماحصل یہ ہوا کہ اس کو امر شرعی سمجھ کر نہ کیا جائے یعنی یہ سمجھ کر کہ عیدین یا جمعہ کے بعد مصافحہ کرنا سنّت ہے اگر یہ ارادہ نہ ہو بلکہ اظہار مسرّت ہو تو جائز ہے۔ بے اصل ہونے کا مطلب یہی ہے یہ نہیں کہ شرعی حکم نہ سمجھنے کے باوجود بھی ناجائز ہو۔

نماز کے بعد مصافحہ وفاتحہ کے جواز وعدم جواز کے سوال پر حضرت مولانا شیخ آدمؒ مفتی باقیات صالحات کا درج ذیل جواب ملاحظہ فرمائیے:

الجواب

"ھوالصواب اگرچہ کہ مصافحہ عندا اللقاء (یعنی دو آدمی ملتے وقت) سنّت ہے۔ لیکن وہ شرعاً ممنوع فعل نہیں بلکہ مومنوں کے مابین کی شکر رنجی اور عداوت کو دور کرنے والا ہے اور بعد نمازِ عید یا بعد نماز جمعہ یا بعد نمازِ صبح وغیرہا میں مصافحہ کرنے کی عادت ہو اور اس کو سنّت یا واجب اعتقاد نہ رکھتے ہوں تو اوقاتِ مذکورہ میں مصافحہ منع نہیں، مباح و جائز ہے۔ ہاں اس کو لازم و واجب سمجھنا بُرا ہے۔ اسی طرح اس کو حرام سمجھنا بھی خطا اور غلط ہے۔

کتبہ شیخ آدم عفی عنہٗ (غیر مطبوعہ دفتر فتاوی شیخنا باقیات صالحات ویلور)

نفس مصافحہ احادیث شریفہ سے ثابت ہے اور مذکور فتاوی کے اعتبار سے عیدین اور جمعہ کے بعد بھی مباح اور جائز ہوا اور لوگ مصافحہ کر رہے

تو اس کو عملاً برا بھلا کہہ کر انتشار پیدا کرنے سے کون سا ثواب ملے گا، سوائے ایک دوسرے کو وہابی نجدی بدعتی وغیرہ کہنے اور لڑنے کے۔

خدا ہمیں نیک توفیق عطا فرمائے۔ حضرت مولانا احمد سعید مجددی لکھتے ہیں:

"چیزے کہ خوبی او از شارع ثابت شد از تخصص وقت و روز حسن آن نمی رود چنان چہ در درالمختار مسطور است المصافحۃ حسنۃ ولو بعد العصر والفجر" (تحقیق الحق المبین: ص ۱۰)

ترجمہ: جس چیز کی خوبی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو گئی ہو وقت اور روز کے تعین و تخصیص سے اس کا حسن زائل نہیں ہوگا۔ چناں چہ درالمختار میں لکھا ہے مصافحہ اچھا ہے عصر اور فجر کی نماز کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

یہ بات کسے معلوم نہیں کہ "درمختار" فتوؤں کی مشہور کتاب ہے جب اس کتاب میں موجود ہے کہ "مصافحۃ حسنۃ" مصافحہ اچھا ہے تو میں نہیں سمجھتا کہ اس کے بعد مجھے کوئی حق پہنچتا ہو کہ میں کہوں مصافحہ اچھا نہیں۔ بہر حال ہماری سعادت مندی اچھائیوں پر عمل کرنے میں ہے۔ عمل نہ کر سکیں تو سکوت بہتر، یہی نہیں فقہ کی دوسری مشہور و معروف کتاب "طحطاوی" میں لکھا ہے کہ مصافحہ صرف ابتدائے ملاقات ہی پر نہیں بلکہ ہر نماز کے بعد بھی سنت ہے۔

چناں چہ ایک صاحب نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے سوال کیا کہ

سوال

بعض احباب نے کتاب "طحطاوی" کی عبارت جو کہ مطبع مصری ص: ۳۰۸ میں واقع ہے: وکذا تطلب المصافحة فهي سنة عقيب الصلوٰة كلها وعند كل لقى سے مصافحہ بعد صلاۃ الفجر و عید وغیرہ سنّت ہونے کا دعوی کیا ہے۔ خواستگار ہوں کہ تشفی بخش جواب مرحمت ہو۔

الجواب

"میرے پاس طحطاوی نہیں کہ اس میں دیکھتا۔ لیکن اس میں یہ عبارت ہو تو یہ اس شخص کے حق میں ہے جو ہر ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا ہو۔ کیوں کہ اس صورت میں تخصیص نہ رہے گی۔ جو علّت تھی بدعت ہونے کی عند کل لقی اس کا قرینہ ہے۔ اس مصافحہ کا حکم سلام کا سا ہو جائے گا اس لیے کہ حسب حدیث "ان من تحیاتکم المصافحه" مصافحہ متمم ہے سلام کا، سلام کا افشاء اس حد تک وارد ہے کہ سلام کے بعد اگر درمیان دیوار حائل ہو جائے تو پھر سلام کرے اسی طرح اس کے متمم میں عموم ہو جائے گا۔ اور جو ان اوقات میں تخصیص کرتا ہو اس کے حق میں بدعت ہونا دوسرے محققین کی تصریحات سے ثابت ہے۔ چناں چہ شامی جلد ۵ میں ہے: قيل في تبيين المحارم عن الملتقط انه تكره المصافحة بعد اداء الصلاة .. الخ.." امداد الفتاوی جدید: ص ۸۱۸

مذکورہ فتویٰ میں حضرت مولانا کا رجحان ہر عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مصافحہ متمم ہے سلام کا یعنی سلام مصافحہ سے تمام اور پورا ہوتا ہے اور سلام کے بعد اگر دیوار درمیان میں حائل ہو جائے تو پھر سلام کرلے۔ اب مصافحہ کے متمم سلام ہونے کا معنی یہ ہے کہ مصافحہ کے اگر درمیان میں دیوار حائل ہو جائے تو پھر دوبارہ مصافحہ کرے گا۔ اس بیان کی روشنی میں عیدین اور جمعہ وغیرہ کی نماز کے بعد مصافحہ کا حکم ظاہر ہے فتویٰ میں دوسرے حوالے کا جواب عیدین وغیرہ کے بعد جواز مصافحہ کے قائل علماء وفقہاء نے یہ دیا ہے کہ صحابہؓ نے عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ نہیں کیا ہے تو منع بھی نہیں فرمایا۔ نیز مصافحہ والی حدیث عام ہے چنانچہ امام احمدؒ و ترمذی و ابنِ ماجہ نے براء ابن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب دو مسلمان مل کر مصافحہ کرتے تو جدا ہونے سے پہلے ہی ان کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ مصافحہ والی حدیث میں یا اور دوسری احادیث میں کسی میں بھی حضورؐ نے نماز کے بعد مصافحہ کرنے سے منع نہیں فرمایا ہے۔

اب آپ اعلیٰ حضرت بریلوی مولانا احمد رضا خان کا یہ فتویٰ بھی پڑھ لیں۔

مسئلہ: عید کے دن بعد نمازِ عید مصافحہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

الجواب

"بعد نمازِ عید مصافحہ و معانقہ دونوں درست ہیں،"

جب کہ کسی منکرِ شرعی پر مشتمل یا اس کی طرف منجر نہ ہو جیسے خوب صورت امرد، اجنبی محلِ فتنہ سے معانقہ بلکہ مصافحہ بھی کہ بحالتِ خوفِ فتنہ اس کی طرف نظر بھی مکروہ ہے کہ مصافحہ نہ کہ معانقہ کما فی درالمختار وغیرہ معتمدات الاسفار۔

فتاوی رضویہ: ج ۳: ص ۸۲۴

چلیے حضرت مولانا کی رائے گرامی بھی معلوم ہوگئی کہ بعد نماز مصافحہ و معانقہ دونوں درست ہیں اور حضرت مولانا اسماعیل دہلوی رسالہ "نذور ہیں" جو مجموعہ زبدۃ النصائح میں چھپا ہے، لکھتے ہیں کہ معانقہ و مصافحہ روز عید گو بدعت نہ ہو بدعت حسنہ ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہمہ اوضاع از قرآن خانی و خورانیدن طعام سوائے کندن چاہ و امثالہ و دعا و استغفار و اضحیہ بدعت است گو بدعتِ حسنہ بالخصوص است۔ مثل معانقہ روز عید و مصافحہ بعد نمازِ صبح یا عصر واللہ تعالی اعلم"۔ (وشاح الجید فی تحلیل معانقۃ العید ص ۹)

ترجمہ: "قرآن خانی کھانا کھلانا سوائے کنواں کھودوانے اور اس جیسی چیزوں اور دعا و استغفار اور قربانی بدعت ہے۔ اگرچہ کہ خاص طور پہ بدعتِ حسنہ ہے جیسے عید کے روز معانقہ اور صبح یا عصر کی نماز کے بعد مصافحہ بدعت حسنہ ہے"۔

چلیئے مولانا اسماعیل جیسی سخت گیر شخصیت نے بھی عید کے معانقے اور صبح وعصر کی نماز کے بعد مصافحہ کو اچھی بدعت بنا دیا ہے نہ بدعتِ سیئہ نہ حرام نہ ناجائز۔

جتنے مفتیانِ کرام کے فتاوی اوپر ذکر کئے گئے ہیں الحمدللہ کسی بھی مفتی صاحب نے عیدین اور جمعہ کی نماز وغیرہ کے بعد مصافحہ کو ناجائز نہیں بتایا ہے بلکہ جائز ہی بتایا ہے اور بعض نے سنّت بھی بتایا ہے تو اب ہماری سعادتمندی اسی میں ہے کہ جہاں اور جس مسجد میں جس نماز کے بعد مصافحہ کرنے کی عادت ہو تو مصافحہ کرنے والوں میں شریک ہو جائیں۔ اگر ہم نے اس میں شرکت کی تو ناجائز کام تو نہیں کیا۔ جائز کام ہی تو کیا ہے اور وہ کام کیا ہے جس سے رنجشیں دور ہوتی ہیں۔ اگر ہم نے ان کا ساتھ نہ دیا تو ظاہر ہے کہ لوگوں میں پھوٹ ڈال دیں گے اور نجدیت و وہابیت کے ٹائیٹل سے بھی نوازے جائیں گے۔

وما علینا الا البلاغ

○

القیام للقادم

ماں باپ، اساتذہ اور بزرگانِ دین کے لیے کھڑے ہونے پر بھی لے دے کرنے والوں اور اس کو ناجائز بتانے والوں کی کمی نہیں ہے۔ اس ٹائپ کے بھائی ذہنی تضاد ہی نہیں بلکہ عملی تضاد میں بھی مبتلا ہیں۔ یہ حضرات اپنے ماں باپ، اپنے اساتذہ اور اپنے بزرگوں کی تعظیم کے لیے تو کھڑے نہیں ہوں گے اور اس کو ناجائز بتائیں گے مگر معمولی ایم ایل اور ایم پی آجائیں تو اپنے دانتوں کی نمائش کے ساتھ سروقد اٹھ کھڑے ہوں گے، آخر کیوں! اس کیوں کا جواب آپ انھیں بھائیوں سے طلب کیجیے! ہم تو یہاں مختصر الفاظ میں کم سے کم حوالوں کے ساتھ ان حضرات کے تذبذب کو دور کرنے کی کوشش کریں گے جو قیام للقادم پر عمل پیرا تو ہیں لیکن منکرین کی وجہ سے تذبذب میں ہیں۔

اب آپ سب سے پہلے اس سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں: مجالسِ الحکمہ کے جامع لکھتے ہیں:

حضرت والا اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ صرف اخلاق ہی سے نہیں

پیش آنے بلکہ ان کا ادب کرتے ہیں ۔ راقم نے دیکھا ہے کہ کان پور سے ایک شخص آیا کرتے تھے جو عالم نہ تھے مگر حاجی صاحب قدس سرہٗ العزیز سے بیعت تھے ، حضرتِ والا اُن کے واسطے کھڑے ہو جاتے اور تکیہ پہ جگہ دیتے ۔ مجلس الحکمہ صف ۱۵

"مُرأۃ الحق" کے مصنف، بانیٔ باقیات صالحات کے استاد حضرت مولانا زین العابدین مائل ویلوری تحریر فرماتے ہیں کہ :

> " درالمختار میں کہا ہے رہبانہ ہیں ہے کہ جائز بلکہ مستحب ہے اٹھ کھڑا رہنا تعظیم کے لیے واسطے آنے ہارے کے، کہے ہیں علماء اگر آوے عالم یا باپ یا استاد اپنا سزاوار ہے اس کو کہ اٹھ کھڑا رہے واسطے تعظیم ان کی، اور سوائے ان تین شخصوں کے، دوسروں کے لیے' قرآن پڑھتے وقت اٹھنا جائز نہیں "
>
> مرأۃ الحق

چلیے مزید معلومات میں اضافہ ہو گیا کہ عالم، استاد یا باپ آئیں تو اُن کے احترام میں قرآنِ پاک کی تلاوت کر رہے ہوں تو بھی اٹھ کھڑا ہونا جائز ہے اس سلسلہ میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتویٰ بھی پڑھ لیں ۔ سوال و جواب درج ذیل ہے :

السوال

کسی شخص کی تعظیم کو کھڑا ہو جانا اور پاؤں پکڑنا اور چومنا تعظیماً درست ہے یا نہیں ۔؟

الجواب

"تعظیم دین دار کو کھڑا ہونا درست ہے اور پاؤں چومنا ایسے ہی شخص کا بھی درست ہے۔ حدیث سے ثابت ہے۔"

فتاوی رشیدیہ: اول: ص ۱۱

اس فتوے کی روشنی میں ان حضرات کو سوچنا چاہیے جو بے سوچے سمجھے اساتذہ، والدین، بزرگوں اور علمائے کرام کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے والوں پر بدعتی ہونے کا الزام لگاتے ہیں اور ادھر مذکور فتوے میں حضرت مولانا نے جب یہ لکھ دیا ہے کہ "اور پاؤں چومنا ایسے شخص کا بھی درست ہے حدیث سے ثابت ہے" تو بزرگوں کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے والوں اور ان کے پیر چومنے والوں کو بدعتی کہہ کر روکنے والوں کو کیا منکرِ حدیث کہنا چاہیے؟ آپ ہی سوچیے!

حضرت مولانا عبدالقادر بادشاہ صاحب مدرس مدرسہ باقیات صالحات لکھتے ہیں:

"مستحب ہے قیام واسطے بادشاہِ عادل، اور والدین اور اہلِ دین اور ورع اور بزرگوں کے اور فاسق و فاجر کے لیے مکروہ و ممنوع ہے۔"

الباقیات الصالحات: ص ۱۹۱

اس عنوان کے تحت مزید معلومات حاصل کرنے، ذہنی الجھنوں سے چھٹکارا پانے کے لیے راقم کا خیال ہے کہ علامہ ارشد القادری کے کتابچہ "شریعت" سے جو انھوں نے جناب پالن حقانی صاحب کی کتاب "شریعت یا جہالت" کے جواب میں لکھا ہے ایک قیمتی اقتباس بے حد مفید رہے گا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

قیام کی بحث

قیام کے خلاف حقانی صاحب نے جس دلیل کو بار بار دہرایا ہے وہ یہ ہے :

۱۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب حیاتِ طیبہ میں قیام کو پسند نہیں فرمایا تو بعدِ وفات کیسے پسند ہو گیا ؟ ص: ۴۵۳

۲۔ آپ صاحبان نے پڑھ لیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کرام کو قیام سے منع فرمایا۔ ص: ۴۵۹

۳۔ مذہب تو اس کو کہتے ہیں، جو قرآن وحدیث سے ثابت ہو جب حدیث سے قیام کرنا منع ثابت ہے تو پھر تاویلیں کرنا بیکار ہے فوراً مان لینا چاہیے اسی کا نام ایمان ہے۔ ص ۴۵

لیکن منع والی حدیث کے ساتھ ساتھ حقانی صاحب نے ایک حدیث اور نقل کی ہے، جو عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں :۔

"جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس آتی تھیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے اٹھتے اور اُن کی پیشانی کا بوسہ لیتے اور اپنے پاس بٹھاتے اور جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے پاس جاتے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھتیں تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بوسہ لیتیں اور اپنی جگہ بٹھاتیں۔"

ص: ۴۵۴

اب سوال یہ ہے کہ قیام اگر حضورؐ کو ناپسند تھا تو سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا حضورؐ کے لیے کیوں قیام کرتی تھیں؟ کیا انھیں حضورؐ کی ناپسندیدگی کا علم نہیں تھا؟ معاذ اللہ! جان بوجھ کر حضورؐ کے حکم کی نافرمانی کرتی تھیں؟

اور دوسرا سوال یہ ہے کہ حضورؐ نے جس طرح صحابۂ کرامؓ کو قیام کرنے سے منع فرمایا تھا، سیدہ فاطمہؓ کو نہیں منع کیا؟

تیسرا سوال یہ کہ جب حضورؐ کو اپنے لیے قیام پسند نہیں تھا تو خود حضورؐ سیدہ فاطمہؓ کے لیے کیوں قیام فرماتے تھے۔

ان تمام باتوں سے ثابت ہے کہ اپنے لیے قیام کرانا اور دوسروں کے لیے قیام کرنا دونوں حضورؐ کے نزدیک جائز تھیں۔

اس کا جواب حقّانی صاحب نے یہ دیا ہے۔

"یہاں پر جو بات چل رہی ہے وہ ساری جماعت کی ہے یعنی مجلسِ میلاد میں ساری جماعت کا اٹھنا کیسے جائز ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ ساری جماعت کے اٹھنے کا ثبوت آپ کو کہیں سے بھی نہیں ملے گا۔" ص ۴۵۵

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ سیدہ فاطمہؓ والی حدیث صرف فرداً فرداً قیام کا ثبوت ملتا ہے، پوری جماعت کے قیام کا ثبوت نہیں ملتا۔ جب کہ میلاد میں پوری جماعت قیام کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پوری جماعت کے قیام کا ثبوت تو خود انھیں کی کتاب میں موجود ہے۔ جب خود وہ اپنی لکھی ہوئی کتاب کو نہیں سمجھ سکتے تو دوسروں کی کتاب کیا سمجھیں گے! اسی سے اندازہ لگا لیجیے ان کے علم وفہم کا۔ موصوف نے فتاویٰ قاضی خان صاحب کے حوالے سے قیام کی بحث میں تحریر فرمایا ہے:

> "چند لوگ قرآن پڑھتے ہوں یا ایک شخص قرآن پڑھتا ہے۔ پھر اس کے پاس کوئی خاص میں سے آیا تو فقہا نے کہا ہے کہ آنے والا مرد عالم ہو یا قاری کا باپ یا استاد تو اس کے واسطے اٹھنا جائز ہے۔" ص: ۴۵۴

اس عبارت سے واضح طور پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ چند لوگ قرآن پڑھتے ہوں تو عالم، استاد یا باپ کے لیے سب کا قیام کرنا جائز ہے۔ کیوں کہ یہ عین ممکن ہے کہ آنے والا سب کا استاد ہو یا سب کا باپ ہو یا سب کے لیے قابلِ احترام عالم ہو تو ایسی صورت میں جب سب کے سب ایک ساتھ اٹھیں گے تو ساری جماعت کا قیام تو خود ہی ثابت ہوگا۔

اب اس کا جواز ثابت کرنے کے لیے مزید کسی دلیل کی حاجت ہی کیا باقی رہی۔ فقہا کا کلام سمجھنے کے لیے جس فہم وبصیرت کی ضرورت ہے اگر وہی

کسی کے اندر موجود نہ ہو تو اس کا علاج ہمارے پاس کیا ہے؟ یہاں ایک سوال اور بھی ہے جو صاحبِ فہم کے لیے خاص طور پر قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کی حالت عین عبادت کی حالت ہے اور اس حالت میں بھی فقہاء نے باپ، استاد اور عالمِ دین کے لیے قیام کی اجازت دی ہے اسی سے بزرگوں کے قیامِ تعظیمی کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے کہ عبادت کی حالت میں بھی اسے نہیں ترک کیا گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ حقانی صاحب کی تحریر کے مطابق جب حدیثوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے قیام کی ممانعت ثابت ہے تو فقہائے احناف امتی کے لیے کیوں جائز قرار دیا گیا۔ اس بات سے فقہاء پر رسولؐ کی نافرمانی کا الزام عاید نہیں ہوتا؟

تیسرا سوال یہ ہے کہ حقّانی صاحب کی تحریر کے مطابق جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ طیبہ میں قیام کو ناپسند فرمایا اور وفات کے بعد بھی قیام انھیں ناپسند ہے تو فقہائے احناف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر حاضر ہونے والوں کو اس بات کی کیوں تلقین فرمائی ہے کہ وہ حضورؐ کے روضہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوں اور اسی ہیئت کے ساتھ صلاۃ و سلام عرض کریں۔

(حوالہ کے لیے دیکھیے عالمگیری باب زیارۃ قبر النبیؐ: ملتقی البحر: ج ۱: ص ۳۱۳
ارشاد الساری لملّا علی قاری)

اس تلقین سے فقہائے احناف پر کیا یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ انہوں نے اُمّت کو حضورؐ کے حکم اور مرضی کے خلاف ایک کام کرنے کی ہدایت فرمائی ہے

اور وہ بھی عین حضورؐ کے روبرو۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ حقّانی صاحب نے اس بات پر بہت زور دیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب قیام کو اپنے لیئے ناپسند فرمایا ہے اور منع فرما دیا ہے تو ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم حضور کی اطاعت کے جذبہ قیام سے رُک جائیں، لیکن اپنی اسی کتاب میں انھوں نے ایک حدیث اور نقل کی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:۔

> "کسی شخص نے آپ سے کہا اے محمدؐ! اے ہمارے سردار، اور سردار کے لڑکے ہم سب سے بہتر اور بہتر کے لڑکے! آپؐ نے فرمایا: لوگو! اپنی بات کا خود خیال کرلیا کرو تمہیں شیطان اِدھر اُدھر نہ کردے۔ میں محمدؐ بن عبد اللہ ہوں، میں خدا کا بندہ اور اس کا رسولؐ ہوں۔ قسم خدا کی میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے میرے مرتبے سے بڑھا دو۔" ص ۲۴۳

اس حدیث کے ذیل میں حقّانی صاحب لکھتے ہیں:

> "میرے عزیز دوستو خوب سوچ! کہ کہنے والے نے کوئی کھوٹی یا بری بات تو نہیں کہی تھی پھر بھی اس کو روک دیا گیا۔ کیوں کہ اگلی امتّوں کی گمراہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔"

جب حضورؐ نے 'ہمارے سردار' کہنے سے روک دیا تو دو لفظوں میں
جواب دیجیے کہ اس ممانعت کے بعد بھی حضورؐ کو 'سردار' کہنا جائز ہے یا نہیں؟
اگر جائز نہیں ہے تو آپ نے اپنی کتاب کے ص: ۲۰۳ پر حضورؐ کو "سردارِ انبیاءؑ"
لکھ کر حضورؐ کے حکم کی صریح خلاف ورزی کی ہے یا نہیں؟ اور اگر جائز ہے تو
جس سے حضورؐ منع فرما دیں وہ کیوں کر جائز ہو گی؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت
کا حوالہ دے کر جب مسلمانوں کو قیام سے روکا جاتا ہے تو تابعداری کا تقاضا ہے
کہ سردار کہنے سے بھی روکا جائے۔ یہ کیا ہے کہ کچھ باتوں میں اطاعت کی جائے اور
کچھ باتوں میں نافرمانی کسی حال میں بھی سچے مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہو سکتا۔

اس کے جواب میں شاید آپ یہ کہیں گے کہ یہاں ممانعت حقیقت
پر مبنی نہیں ہے۔ بلکہ انکسار و تواضع پر ہے۔ میں عرض کروں گا کہ بالکل یہی
صورت قیام کے مسئلے کی بھی ہے۔ اگر وہاں ممانعت حقیقت پر محمول ہوتی تو
سیدہ فاطمہؓ بھی کبھی قیام نہ فرماتیں! فقہائے احناف حضورؐ کے روضۂ مبارک
پر حاضر ہونے والوں کو بحالتِ قیام سلام پڑھنے کا حکم کبھی نہ دیتے اور شرع میں
رسولؐ کے لیے اگر قیام نہ ہوتا تو استاد، باپ اور عالمِ دین کے لیے ہرگز قیام
کی اجازت نہ ملتی اور یہ بھی سُن لیا جائے کہ یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ امّت کے
معتمد علماء اور اسلام کے عظیم المرتبت ائمہ کا یہی مسلک ہے۔ یہاں تک کہ
دیوبندی جماعت کے مشہور پیشوا حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی
کہا ہے۔ جیسا کہ فتاوی اشرفیہ میں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے (قیام) کیوں نہیں پسند

فرمایا۔ اس کی وجہ تواضع و سادگی و بے تکلفی تھی۔ چناں چہ مرقاۃ میں اس طرح ہے۔"

فتاویٰ اشرفیہ: ج ۱: ص ۱۸۲

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعلق حقانی صاحب کا یہ کہنا "جمہور علمائے اسلام کے مسلک کے خلاف ہے"، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کو کھڑے ہونے کا جو حکم دیا تھا "وہ اظہارِ تعظیم کے لیے نہیں تھا بلکہ سواری سے اتارنے کے لیے تھا۔" کیوں کہ مسلم شریف کی اسی حدیث کی شرح میں امام نووی رح نے ارشاد فرمایا ہے، اس حدیث سے بزرگوں کے لئے قیامِ تعظیمی کا ثبوت ملتا ہے اور اسی بنیاد پر جمہور علمائے قیام کے مستحب ہونے کا فتوے دیا ہے۔ (مسلم شریف: ج ۲: ص ۹۵)

علاوہ ازیں حقانی صاحب جس دیوبندی مکتبِ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں ان کا بھی عمل درآمد اسی مسلک پر ہے کہ حضور ؐ کا یہ حکم حضرت سعد رض کی تعظیم کے لئے تھا، جیسا کہ 'الجمعیۃ' کے شیخ الاسلام نمبر میں اس کی صراحت ان لفظوں میں موجود ہے۔

"دار العلوم دیوبند کا طریقہ قوموا لسیدکم کے مطابق یہ رہا ہے کہ بڑوں کی آمد کے وقت ادباً چھوٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔"

شیخ الاسلام نمبر: ص ۹۴

یوں ہی حقانی صاحب کا یہ الزام بھی نہایت جھوٹا اور افترا ہے کہ میلاد کی محفل میں ہم اس لیے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ حضورؐ تشریف لاتے ہیں، یہ اگرچہ ناممکن نہیں ہے، جیسا کہ خود حقانی صاحب نے اپنی اسی کتاب میں اعتراف کیا ہے۔

> "میرا ایمان وعقیدہ تو یہ ہے کہ کسی خاص غلام پر کرم فرما کر آنا چاہیں تو ان شاء اللہ یقیناً آسکتے ہیں اور جن مجالس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں وہ مجالس انوار سے بھرپور اور خوشبو سے معطر ہو جاتی ہیں۔"
>
> شریعت یا جہالت: ص ۴۶۳

لیکن اس اعتقاد کو قیام کی بنیاد بتانا غلط ہے۔ بلکہ ہم اس لیے کھڑے ہوتے ہیں کہ قیام اظہارِ تعظیم کا ایک معروف ذریعہ ہے اور بارگاہِ رسالتؐ میں ذہنی استحضار اور سرورِ کائناتؐ کے ساتھ شعوری ارتباط کی اس سے تجدید ہوتی ہے اور تصوّر کی بنیاد پر غائبانہ تعظیم کا سلسلہ شریعت میں پہلے سے موجود ہے۔ جیسا کہ بول وبراز کی حالت میں خانۂ کعبہ کی طرف رُخ اور پشت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اور یہ حکم ساری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ہے۔ عام ازیں کہ کعبہ اُن کے پیشِ نظر نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ قیام کی بحث اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ یہاں تمام ہو گئی اور حقانی صاحب نے قیام کے خلاف جو دلائل پیش کئے تھے انھیں سے قیام کا جواز ثابت کر دیا گیا۔

مذکور حوالہ میں میلاد کی محفل میں کھڑے ہونے کی بات آئی ہے تو چلیئے اس پر اور کچھ فتاوی پڑھ کر بحث ختم کرلیں۔ پہلے مجموعۂ فتاوی کا یہ سوال وجواب ملاحظہ فرمالیں۔ سوال وجواب فارسی میں ہے۔ طولِ عبارت سے بچنے کے لیے اس کا ترجمہ پیشِ خدمت ہے۔

سوال

ذکرِ ولادتِ باسعادت کے وقت کھڑے ہونا کیا حکم رکھتا ہے؟

الجواب

"اگر کوئی شخص اس وقت ریا کاری اور تصنع کے بغیر بحالتِ وجدِ صادق کھڑا ہو جائے تو معذور ہے اور یہ بات آدابِ صحبت میں داخل ہے کہ اس کی اتباع میں حاضرینِ مجلس بھی کھڑے ہو جائیں اور بغیر حال اور وجد کے اپنے اختیار سے کھڑے ہونا نہ فرض ہے نہ واجب اور نہ سنّتِ مؤکدہ اور نہ ہی مستحب بمعنیٔ عرفی شرعی اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں ہے اور نہ ہی یہ طریقہ قرونِ ثلاثہ میں تھا۔ لیکن غزالیؒ "احیاء العلوم" میں تحریر فرماتے ہیں:

انسؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ بعض حالت میں قیام نہیں فرماتے تھے۔ لیکن علمائے حرمینِ شریفین قیام کرتے ہیں۔ اور امام برزنجیؒ رسالۂ مولد میں لکھتے ہیں کہ: قد استحسن القیام عند ذکر مولدہ الشریف ائمة ذوو روایة فطوبی لمن کان تعظیمہ صلی اللہ علیہ وسلم غایة مرامہ ومرماہ

انتہی ۔ صاحب الرائے ائمہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد شریف کے ذکر وقت کھڑے ہونے کو مستحسن بتایا ہے ۔ اگر قیام سے مقصود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم ہو تو بڑی پسندیدہ بات ہے ۔

مجموعۂ فتاوے : ج ۳ : ص ۱۳۰

بہر حال مذکور فتوے سے پتہ چلا کہ قیام بدعت تو نہیں ہے ورنہ مکہ اور مدینہ شریف کے علمائے کرام قیام نہیں کرتے اور امام برزنجیؒ قیام کو مستحسن نہ بتاتے ۔

اب چلتے چلتے فاضل دیوبند مولانا عامر عثمانیؒ صاحب مدیر 'تجلّی' کا یہ سوال و جواب بھی پڑھ لیں :

سوال : از : رضوان احمد اعظم گڈھ

کیا قومی گیت جن گن من کا احترام ہم لوگوں کو کرنا چاہیے وہ کہیں بھی گایا جاتا ہو ؟

جواب : "ضرور کرنا چاہیے ، نہیں کریں گے تو مجرم قرار پائیں گے ۔ اس کا احترام صرف کھڑے ہونا ہے ۔ کیا مضائقہ ہے اس میں جب کہ یہ قومی ترانہ ہے ۔"

'تجلّی' دیوبند : جون ۱۹۷۳ء ص ۲۸

سمجھے آپ ! نہ کھڑے ہوں تو مجرم قرار پائیں گے اور اس کا احترام صرف کھڑے ہونا ہے اور کچھ نہیں ۔ اس میں کیا مضائقہ ہے !

کاش قیام عند السلام اور تقبیل ابہامین پر بھی مانعین اور مجوزین دونوں یہی انداز اختیار کرتے اور کہتے کہ اس میں حضورؐ کا احترام ہے ۔ آخر

اس میں کیا مضائقہ ہے۔ احترامِ نبیؐ تو سعادتِ دارین ہے تو آپس کا جھگڑا مٹ جانا، تو تو، میں میں ختم ہو جاتی

اور حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ لکھتے ہیں:

"فقیر کا مشرب یہ ہے کہ محفلِ مولود شریف میں شریک ہوتا ہوں بلکہ ذریعہ برکات سمجھ کر ہر سال منعقد کرتا ہوں اور قیام میں لطف و لذّت پاتا ہوں۔" فیصلۂ ہفت مسئلہ: ص ۸۔

"حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا قاسم نانوتوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پیر و مرشد ہیں۔ ان بزرگوں میں سے کسی کا فتویٰ اگر پیر و مرشد کے خلاف ٹھہرا ہو تو کم از کم مجھے یقین ہے کہ ظاہرا ہوگا، کسی دینی مصلحت کے مدنظر ہوگا۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آیا ہو تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مندرجہ ذیل بیان پڑھ لیں اور خود فیصلہ فرمالیں۔

.... قصۂ کانپور متعلق قیام

فرمایا کہ لوگ ہمارے گروہ کو کہتے ہیں کہ قیام کو ہم حرام سمجھتے ہیں اور باوجود یہ کہ ہم زبان سے ظاہر کرتے ہیں اور علی رؤس الاشہاد کہتے ہیں کہ ہم حرام نہیں سمجھتے تو کر کے دکھاؤ اس سے معلوم ہوا کہ قول جب ہی معتبر ہو سکتا ہے جب کہ فعل بھی اس کے مطابق ہو۔ یہ انھیں کا مسلم مسئلہ ہوا اب

ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ لوگ قیام کو فرض سمجھتے ہیں۔ وہ زبان سے
اس کے خلاف کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارے اوپر بہتان ہے
ہم قیام کو فرض نہیں سمجھتے۔ ہم اُن پر انھیں کے مسلّم مسئلہ
کو پیش کرتے ہیں کہ اس زبانی دعوے کو ہم صحیح جب تسلیم کرینگے
جب کہ فعل بھی اس کے مطابق کر کے دکھائیں۔ یعنے قیام
نہ کریں۔ غرض ان کا دعویٰ ہے کہ ہم قیام کو حرام سمجھتے ہیں اور
ہمارا دعویٰ کہ وہ قیام کو فرض سمجھتے ہیں اور ہم سے ہر ایک دوسرے
کے دعویٰ کو اتہام کہتا ہے تو آپ ہی کے قول کے بموجب فیصلہ
یوں ہوسکتا ہے کہ ہم قیام کر کے دکھادیں۔ اور آپ قیام چھوڑ کر
سو جگہ مولود شریف کیجیے، ہم بھی شریک ہوں اور وہ بھی پچاس
جگہ قیام ہو ہم بھی کریں گے اور پچاس جگہ نہ ہو، وہ بھی نہ کریں۔
واضح ہوجائے گا کہ کون کہاں تک اپنے قول میں سچّا ہے اس پر
کوئی پکّا نہ ہوا اور لما تقولون مالا تفعلون کا ظہور ہوگیا۔"

ملفوظات ملقب بہ مجالس الحکمۃ: قسط ۲: ص ۴۸

اب حقیقت آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ اس قسم کے فروعی مسائل
لڑنے جھگڑنے کی چیزیں نہیں ہیں۔ نیز جلیل القدر علمائے کرام کے فتاوی
اور ان کے زرین آراء کو خاطر میں نہ لانا مسلمانوں میں اختلاف و نزاع پیدا
کردینا قومی سیاہ بختی اور عاقبت نااندیشی ہوگی اور یہ چیز خدا نہ کرے ہم
مسلمانوں کو ذلیل کر کے رکھ دے گی۔ اللھم احفظنا

سُنّی بہشتی زیور کے مؤلف رح لکھتے ہیں :

"اس مجلس میں ذکرِ ولادت کے وقت قیام کیا جاتا ہے یعنی کھڑے ہو کر درود وسلام پڑھتے ہیں اور نیت یہ ہوتی ہے کہ جب ہمارا درود وسلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش ہوگا تو اسی تعظیمی ہیئات کے ساتھ پیش ہو علمائے کرام نے اس قیام کو مستحسن اور باعثِ ثواب فرمایا ہے بعض بزرگانِ دین کو اس مجلسِ پاک میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف بھی حاصل ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ حضورؐ اس موقع پر تشریف لاتے ہیں۔ مگر کسی غلام پر اپنا کرم خاص فرمائیں اور تشریف لے آئیں تو اُن کے کرم سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔" سُنّی بہشتی زیور صـ ۲۸۹

میلاد کی مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے امکان کا "شریعت یا جہالت" کے مؤلف حقانی صاحب نے خود بھی کس درجہ یقین و ایمان کے ساتھ اقرار کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے: لکھتے ہیں :

"میرا ایمان وعقیدہ تو یہ ہے کہ کسی خاص غلام پر کرم فرما کر آنا چاہیں تو انشاء اللہ یقیناً آسکتے ہیں۔ اور جن مجالس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں وہ مجلس انوار سے

بھر پور اور خوشبو سے معطر ہو جاتی ہیں۔"

شریعت یا جہالت: ص ۴۶۳

مذکور فتاوی اور دلائل و براہین کا ایک اور مرتبہ گہری نظر کے ساتھ مطالعہ فرمائیے اور خود فیصلہ کیجیے کہ قیام کے جائز اور عمدہ ہونے میں بحث کا وہ کون سا گوشہ تشنہ رہ گیا ہے۔ اور وہ کون ہیں جو ہم میں اختلافات کے بیج بوتے ہیں۔ اور کیوں؟

○

دست بوسی قدم بوسی

دست بوسی اور قدم بوسی احادیثِ شریفہ، فقہی تصریحات اور جلیل القدر علمائے کرام کے عملی نمونوں کے باوجود اس کو بدعتِ سیئہ اور دست بوسی و قدم بوسی کرنے والوں کو بدعتی کے ٹائیٹل سے نوازنے والے ہمارے نیک بھائی غیر عالم ہوتے تو ہمیں حیرت نہ ہوتی۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ بدعت کی گردان کرنے والے غیر عالم بھی ہیں۔ یہ جو بھی ہو آئیں اور درجِ ذیل دلائل و براہین کی روشنی میں اس مسئلہ کی حقیقت معلوم کرلیں اور ناحق گروہ بندی سے بچ جائیں۔ اگر خدا نیک توفیق دے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دست بوسی اور قدم بوسی پر جواہر الفقہ جلدِ اول میں مفصل بحث کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> "بس مختصر بات یہی ہے کہ سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تعاملِ صحابہؓ میں اس کی جو حد منقول ہے اس کو اسی حد پر رکھا جائے تو بلاشبہ دست بوسی، قدم بوسی، معانقہ، مصافحہ سب جائز بلکہ سنّت و مستحب ہیں اور جہاں اس میں غلو

کا پہلو یا دوسروں کی ایذا رشامل ہو جائے وہ گناہ ہے۔"
جواہر الفقہ: جلد اول: ص ۲۰۲

دیکھ رہے ہیں آپ حضرت مولانا نے دست بوسی، قدم بوسی وغیرہ کو سنّت بتایا ہے۔ ہمارے وہ بھائی جو اس کو بدعت سمجھتے ہیں، انھیں اپنی معلومات کا جائزہ لینا چاہیئے۔

مولانا امجد علی رضوی صاحب لکھتے ہیں:

"عالم دین اور بادشاہِ عادل کے ہاتھ کو بوسہ دینا جائز ہے بلکہ اس کے قدم چومنا بھی جائز ہے بلکہ اگر کسی نے عالم دین سے یہ خواہش کہ آپ اپنا ہاتھ یا قدم مجھے دیجیئے کہ میں بوسہ دوں تو اس کے کہنے کے مطابق وہ عالم اپنا ہاتھ، پاؤں بوسہ کے لیے اس کی طرف بڑھا سکتا ہے۔" (درمختار)
بہارِ شریعت: حصہ شانزدھم: ص ۸۵

حضرت مولانا نے یہ فتویٰ درمختار کے حوالے سے دیا ہے جو فتوی کی مشہور کتاب ہے۔ اب ان مہربانوں کو کیسے سمجھائیں جو سادات و مشائخین کرام کو ناحق بدنام کرتے پھرتے ہیں کہ یہ لوگ ایک طرف دست بوسی، قدم بوسی جیسی بدعتوں کو فروغ دے رہے ہیں تو دوسری طرف قبر پرستی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ افسوس کہ ہمارے بھائی جانتے نہیں ہیں کہ سنت کیا ہے؟

اور بدعت کون سی ہے؟ قدم بوسی اور دست بوسی جیسی سنّت کو بدعت کہتے ہیں اور قبر پہ مراقبہ کرنے اور منکرات سے پاک صاف عرسوں کو بھی جو مباح اور جائز ہیں قبر پرستی کہتے ہیں۔ البتہ ان لوگوں کی بات اور ہے جو قبروں کو سجدے کرتے ہیں وہ تو بے شک وشبہ قبر پرستی ہے۔

اب آپ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی کا فتوی ملاحظہ فرمایئے لکھتے ہیں:

> "تقبیل دستِ عالِم و متورع و سلطانِ عادل و حاکم متدین بر سبیل تبریک و تعظیم اسلام مضائقہ ندارد واما بغیر ازیں پس مکروہ است"
>
> مجموعہ فتاوی: ج ۳: ص ۱۲۰
>
> ترجمہ:۔ عالم، پرہیزگار شخص، بادشاہ عادل، متدین حاکم کی دست بوسی تبرک کے طور پہ اسلام کی تعظیم کے لیے مضائقہ نہیں ہے۔ ان کے سوا دوسروں کی دست بوسی دوسرے اغراض سے مکروہ ہے۔

غور فرمایا آپ نے مذکور شخصیتوں کی دست بوسی کرنا اسلام کی تعظیم کرنا ہے۔ اس لیئے کہ وہ قرآن وحدیث کے عالم ہیں، پرہیزگار ہیں، شریعتِ مطہرہ کے احکام کے مطابق حکومت کرتے ہیں تو ہم اس کی نہیں اسلام کی تعظیم کرتے ہیں۔ لہذا ہم بے سوچے سمجھے جرح کر کے آخر کار

نادم وشرمندہ کیوں ہوں۔ مذکور فتویٰ سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ دوسرے دنیوی اغراض کے لیے دست بوسی کرنا کراہت سے خالی نہیں ہے۔ بہرحال بزرگوں کی دست بوسی وقدم بوسی جائز ہے۔اس لیے کہ صحابہؓ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک، پائے مبارک کے بوسے لیئے ہیں۔ اور چوما ہے۔

چناں چہ حدیثِ شریف میں ہے: عن زارعؓ وکان فی وفد عبد القیس قال لما قدمنا المدینۃ فجعلنا نتبادر من رواحلنا فنقبّل ید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ورجلہ (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ: زارعؓ جو وفد عبد القیس میں تھے وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم مدینہ آئے تو اپنی سواریوں سے جلد جلد اتر پڑے اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کا بوسہ لیا۔

اگر ہاتھ پیر چومنا منع ہوتا جائز نہ ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہؓ کو روک دیتے۔جب آپؐ نے نہیں روکا تو معلوم ہوا ہاتھ پیر چومنا سنّت ہے

یہ بھی پڑھیے کہ مدرسۂ سہارن پور میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے "الفصل للوصل" کے مرتب لکھتے ہیں:

> "مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسۂ سہارن پور فرمارہے تھے کہ حضرتِ والا کو کتنی دیر ہوگئی ہے کہ برابر ہاتھ اٹھائے ہوئے ہیں اور لوگ ہیں کہ برابر مصافحہ کرنے کی برکت حاصل کر رہے ہیں۔کوئی چومتا ہے کوئی آنکھوں سے لگاتا ہے۔جس سے حضرتِ والا کو

یقیناً تکلیف ہو رہی ہے۔ چناں چہ ناظم صاحب ممدوح نے نووارد اصحاب سے فرمایا کہ آپ لوگ اب صرف ملاقات و زیارت پر اکتفا کر لیں۔ مصافحہ سے مجمع کو پھاندنا پڑتا ہے اور حضرتِ والا کو بھی تکلیف ہو رہی ہے۔ لیکن حضرت والا نے فرمایا کہ نہیں نہیں میری وجہ سے کسی کو منع نہ کیا جائے۔ یہ حضرات میری محبت سے آئے ہیں۔"

"الفضل للوصل": ص ۴۰

مذکورہ حوالہ میں مرتب اپنا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہے ہیں "لوگ ہیں کہ برابر مصافحہ کرنے کی برکت حاصل کر رہے ہیں، کوئی چومتا ہے کوئی آنکھوں سے لگاتا ہے۔" اب آپ ہی بتائیے کہ دست بوسی بدعت اور ناجائز ہوتی تو حضرت مولانا تھانویؒ اس کی اجازت دیتے؟ یہی نہیں لوگوں کو ہاتھ چومنے دست بوسی کرنے سے روکنے والوں کو بھی آپ نے منع کر دیا۔

"فصل الخطاب" کا یہ حوالہ بھی پڑھ لیجیے:

"حضرت مولانا باقر آگاہ مدراسی "احسن التبیین" میں اپنے استاد کے احترام کے متعلق لکھتے ہیں کہ "وبعد فراغت از درس دست یا زانو یا پائے اورا بحسب عظیم الشان استاد بوسہ دہد"

ترجمہ: درس سے فراغت کے بعد ہاتھ یا زانو یا قدموں کو استاد کی عظمت شان کے موافق بوسہ دے۔

فصل الخطاب: ص ۷۹

دست بوسی سے متعلق مذکور دلائل و براہین کی موجودگی میں اگر کوئی شاگرد اپنے استاد کے اور کوئی مرید اپنے پیر کے ہاتھ چومتا ہے تو ہمیں پریشانی کیوں ہے؟ کوئی مانے یا نہ مانے ہماری ناقص رائے میں اولاد کا والدین سے شاگردوں کا استادوں سے، مریدوں کا پیروں سے کٹتے جانے کے مختلف اسباب میں یہ بھی ایک سبب ہے کہ ہم نے سنّت کے موافق اولاد کو والدین کے سامنے اور شاگردوں کو استادوں کے سامنے، اور مریدوں کو پیروں کے سامنے ابتداء ہی سے جھکنا نہیں سکھایا۔ لہٰذا ہر بونا اپنے آپ کو اونچا سمجھنے لگا عقلمندوں کے لیے اشارہ کافی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ قیام اور قدم بوسی سے متعلق لکھتے ہیں:

> "تعظیم دین دار کو کھڑا ہونا درست ہے اور پاؤں چومنا ایسے ہی شخص کا بھی درست ہے۔ حدیث سے ثابت ہے۔"
>
> فتاوی رشیدیہ: ج ۱: ص ۱۱

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے کھلے الفاظ میں لکھ دیا کہ پاؤں چومنا ایسے ہی شخص کا درست ہے، حدیث سے ثابت ہے۔ حدیث سے ثابت ہے تو پھر چوں وچرا گستاخی ہے۔ تاہم بعض احباب سوال کرتے ہیں کہ قدم بوسی میں رکوع کی شان میں جھکنا پڑتا ہے آیا یہ جائز ہے؟ اس سوال کا جواب آپ کو حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کے ہاں ملے گا۔ سوال وجواب پڑھ لیجیے

سوال

اگر قدم بوسی بلا کراہت جائز ہو تو سر جھکا کر اگرچہ بہ حد رکوع و سجود ہو جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

"قدم بوسی کے لیے جھکنا اور قدم موضوع علی الارض (زمین پر ٹکے ہوئے قدم) تک منہ لے جا کر چومنا جائز ہے اور یہ انحناء یا خرور چوں کہ خود مقصود نہیں بلکہ قدم بوسی کا ذریعہ ہے اس لیے انحناء (جھکنا) اور رکوع کی ممانعت اس کی طرف متوجہ نہیں۔ کیوں کہ ممنوع وہ انحناء ورکوع ہے جو قصداً تعظیم کی نیت سے کیا جائے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کے پاؤں میں دوا لگانے کے لیے جھکے تو یہ انحناء تو ضرور ہے، مگر اس کو کوئی بھی ناجائز کہنے کی جرأت نہ کرے گا۔ کیوں کہ بضرورت اور غیر مقصود ہے۔ درمختار کی عبارت ان یدفع الیہ قدمہ ویمکنہ من قدمہ لیقبلہ اور غایۃ الاوطار کی عبارت " اپنا قدم اس کی طرف بڑھا دے " سے سمجھنا کہ قدم چومنے کی اجازت بغیر انحناء وامالہ کے ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ دفع قدم اور قدم بڑھا دینے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اگر قدم بوسی کا ارادہ کرنے والا کھڑا ہو تو جس بزرگ کا قدم چومنا ہے وہ اپنا قدم اس کے منہ تک اٹھا کر چومنے کا موقع دے۔ دفع قدم اور قدم بڑھا دینے سے چومنے والے کی طرف پاؤں پھیلا دینا مراد

ہے اور اس صورت میں لامحالہ چومنے والا کھڑے یا بیٹھے
ہونے کی حالت میں قدم تک جھک کر ہی چومے گا۔“
کفایۃ المفتی: ج ۹ : ص ۱۰۰

اس فتوی میں حضرت مفتی صاحب کا پہلا جملہ دوبارہ پڑھیے آپ نے صاف لکھا ہے قدم بوسی کے لیے جھکنا اور قدم تک منہ لے جا کر چومنا جائز ہے۔ آپ کے اس فتوی کو بھی حسب تصریح حضرت مولانا مفتی ظفیر احمد صاحب، دارالعلوم دیوبند کا ہی فتوی کہنا چاہیے اس لیے کہ حضرت مفتی ظفیر احمد صاحب فتاوی دارالعلوم دیوبند کی پہلی جلد کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

”اسی طرح فقیہ الامت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب بھی دارالعلوم ہی کے تلمیذ رشید تھے اور برابر مجلسِ شوریٰ کے رکنِ خصوصی بھی رہے۔ اس لیے آپ کی خدمت افتاء بھی اسی دارالعلوم کی ایک شاخ ہے۔“
مقدمہ فتاوی دارالعلوم: ص ۱۰۸

اب آپ آخر میں مجدد جنوبی ہند حضرت قطب ویلور کی کتاب ”فصل الخطاب بین الخطاء والصواب“ کا یہ اقتباس پڑھ لیجیے تحریر فرماتے ہیں:

"صاحب "المنبہ" درمختار کی عبارت" اجابہ" کے تحت کہا ہے کہ بے شک صحابہ رضی اللہ عنہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دست بوسی اور قدم بوسی کیا کرتے تھے جیسا کہ "الاختیار" میں مذکور ہے۔ انتہی۔ شیخ الہند اور شرح سفر السعادۃ" میں لکھتے ہیں کہ بعض احادیث میں آیا ہے کہ قبیلۂ عبدالقیس کے افراد جب مدینۂ منورہ پہنچتے تو اپنی سواریوں سے اتر پڑتے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اور پاؤں کو بوسہ دیا کرتے تھے۔ امام ابوداؤد نے اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ انتہی شیخ الہند ترجمۂ مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں "صاحب صحیح المسلم امام مسلم" جب صحیح البخاری امام بخاری رح کی خدمت میں حاضر ہوتے تو عرض کرتے تھے کہ مجھے آپ کی قدم بوسی کا موقع عنایت فرمائیے۔ انتہی .... خادم عباس رض، حضرت صہیب رض، فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو حضرت عباس رض کے ہاتھ اور پیر چومتے ہوئے دیکھا ہے" انتہی۔

کوتاہ نظر اشخاص قدم بوسی کے مسئلہ میں بزرگوں کو طعنہ دیتے ہیں۔ ان کی یہ طعنہ زنی ان کے علم کی کمی اور ان کے گستاخ و بے باک ہونے کی نشان دہی کر رہی ہے"

اللطیف ۱۴۱۱ھ: ص ۳۳ ماخوذ۔ مترجم مولانا بشیر الحق قادری
استاذ دار العلوم لطیفیہ، ویلور

○

نوشاہ کے گلے میں پھولوں کا ہار

آج کل چند حضرات نوشاہ کے گلے میں پھولوں کا ہار دیکھنا پسند نہیں کرتے، دیکھ لیں تو بس غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ لیکن حج سے واپس آنے والے حاجیوں، لیڈروں، وزیروں اور صدروں کو خود اپنے دستِ مبارک سے پھولوں کے ہار پہنائیں گے، مگر نوشاہ کے گلے میں دیکھنا گوارا نہیں۔ کیوں؟ پتہ نہیں! کسی نکاح کی مجلس میں پہنچ گئے اور نوشاہ کے گلے میں ہار دیکھا تو پہلے نکلوانے کی کوشش کریں گے جیسے ہار پہننا گناہِ عظیم ہو۔ ورنہ مجلس سے نکل جائیں گے۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے آپ مطلقاً پھولوں کا ہار پہننے اور پہنانے کے جواز پر عملی ثبوت چاہتے ہوں تو اس کتاب کے "عرضِ مؤلف" کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو علم ہوگا کہ جنوبی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ باقیات صالحات کے ناظر و مفتی اعظم حضرت مولانا شیخ آدمؒ صاحب نے شمالی ہند کے سب سے بڑے مدرسہ دار العلوم دیو بند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید احمد حسین مدنیؒ کو پھولوں کا ہار پہنایا اور آپ نے پہن لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ پھولوں کا ہار پہننا اور پہنانا مکروہ بھی ہوتا تو باقیات صالحات کے کم از کم

دو سو[2] طلبۃ العلوم اور ۲۵ اساتیذۂ کرام کو یہ منظر دیکھنے کے لیے ہرگز نہیں ملتا۔

اب آپ اس مسئلہ پر مختلف مفتیان کرام کے فتاویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ ’کفایۃ المفتی‘ کا یہ سوال و جواب پڑھیے:

سوال

بوقتِ شادی نوشاہ کے سر پر جو سہرا مکنا ڈالتے ہیں جائز ہے یا ناجائز؟ اور گلے میں سہرا ڈالا جا سکتا ہے یا نہیں؟

الجواب

”سہرہ سر پر ڈالا جاتا ہے اگر اس کو گلے میں ڈال دیا جائے تو وہ سہرے کے حکم میں نہیں رہتا۔ سر پر سہرا ڈالنا ناجائز ہے کہ وہ ہندوؤں کی رسم ہے۔ گلے میں ہار ڈالنا جائز ہے۔“

کفایۃ المفتی: ج ۹: ص ۷۷

نوشاہ کے گلے میں ہار سے متعلق حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے اس جواب کو پڑھ لینے کے بعد ہمیں یقین ہے کہ کم از کم علمائے ربّانی اس کے جواز و عدمِ جواز کی بحث چھیڑ کر مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کی نامسعود سعی ہرگز نہیں کریں گے۔ مولانائے موصوف کا فتویٰ درحقیقت دارالعلوم دیوبند کے ہی فتوے کے حکم میں ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو تو فتاویٰ دارالعلوم کا مقدمہ پڑھ لیں۔ مرتب فتاویٰ لکھتے ہیں: ”اسی طرح فقیہ الامت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ بھی دارالعلوم ہی کے تلمیذ رشید تھے اور برابر مجلسِ شوریٰ کے رکنِ خصوصی بھی رہے۔ اس لیئے آپ کی خدمتِ افتاء بھی

اسی دارالعلوم کی ایک شاخ ہے۔"

مقدمہ فتاویٰ دارالعلوم: ص ۱۰۸

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے گلے میں ہار ڈالنے کو جائز بتایا ہے اور سہرا باندھنے کو ہندوؤں کی رسم بتا کر ناجائز بتایا ہے۔ مگر بعض علماء سہرا باندھنے کو بھی ناجائز و حرام نہیں بتاتے چنانچہ مدیر "تجلّی" حضرت مولانا عامر عثمانی صاحبؒ فاضل دیوبند لکھتے ہیں:

> "سہرا باندھنا عجمی رسم ہے مسلمان اس سے پرہیز کریں تو اچھا ہے۔ لیکن اسے حرام قرار دینے کی کوئی دلیل نہیں۔"
>
> (تجلّی دیوبند: جولائی اے۱۹ء: ص ۲۸)

سر پہ سہرا باندھنا حرام و ناجائز ہونے ہی پہ دلیل نہ ہو تو ہار گلے میں ڈالنا ناجائز ہونے پہ دلیل کہاں سے آئے گی؟ البتہ سہرا باندھنا ناجائز ہونے پہ دلیل ہندوؤں کی رسم ہونا بتائی جاتی ہے۔ اس کو بعض دوسرے علماء تسلیم نہیں کرتے تو سہرا باندھنا مختلف فیہ مسئلہ ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ سہرے سے پرہیز کرنا اچھا ہے۔ اب اگر کسی بھائی کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ نوشاہ کے گلے میں ہار پہنانے سے متعلق جنوبی ہند کی دو عظیم درس گاہوں دارالعلوم لطیفیہ ویلور اور دارالعلوم باقیات صالحات کا فتوی کیا ہے؟ تو ہم ان کی معلومات کے لیے حضرت قطب ویلور قدس سرہٗ کے داماد اور ہمشیر زادے حضرت مولانا مولوی مفتی سید محمد صاحب قادریؒ کا دیا ہوا فتویٰ پیش

کر رہے ہیں:

سوال

پھول کا ہار نوشاہ کے گلے میں ڈالنا جائز ہے یا نہیں؟ نوشاہ پھول کا ہار ڈالے گا کر کے معلوم ہوا تو اس میں تشبیہ بالکفار ہوتی ہے کر کے اجابت دعوت نہ کرنا، اور اجابت کر کے حاضر ہو گئے بعد اس کو دیکھے تو نکلوانا، والّا آپ مجلس سے چلا جانا، بے جا ہے یا بجا؟ بینوا و توجروا:

الجواب

"حامداً اللہ و مصلیاً و مسلما علی رسولہ و آلہ و صحبہ: پھول کا ہار گلے میں ڈالنا جائز ہے۔ کیوں کہ پھول کے ہار میں دو چیزیں ہیں ایک پھول، وہ تو انواع زینت و منافع اور اقسام طیب سے ہے۔ اور زینت و منافع مباح اور طیب (خوش بو) پسندیدۂ رب العالمین و سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ قال اللہ تعالیٰ من حرّم زینۃ اللہ التی أخرج لعبادہ والطیبات من الرزق۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حبّب الی من دنیاکم ثلٰث النساء والطیب وقرّۃ عینی فی الصلاۃ

دوسری ہیئت ہار کی اس میں تشبہ بکفار ثابت نہیں ہوتی اس لیے کہ تشبہ بد وہی ہے جو مذموم چیز میں ہو اور قصد تشبّہ کا ہو اور مذموم چیز شعارِ کفّار ہے اور شعار علامت خاص کو قوم کی کہتے ہیں۔ جو لباس وغیرہ میں ہوتی ہے۔ نہ عاداتِ مشترکہ

اقوام کو مثل عادات باشندگان ایک ملک یا ایک بلدہ کے اکثر باہم مشترک ہوتے ہیں، خواہ جنس الاکل و شرب میں ہو، خواہ لباس و مکانات میں اور پھول کا ہار شعار کفار سے نہیں ہے بلکہ عادات مشترکۂ اہلِ ہند سے ہے کہ اہلِ اسلام و کفار یہاں کے اس کو اپنی شادیوں اور ضیافتوں وغیرہ، محفل سرور میں استعمال کرتے ہیں۔ اور بالفرض ہار اصل میں کفار سے ماخوذ ہو تو بھی کچھ ضرر نہیں کیوں کہ مسلمانانِ ہند بھی جب اس کو باعتبارِ اباحتِ اصلی استعمال کئے اور یہ استعمال ان میں شائع ہو گیا۔ تو اب شعارِ کفار باقی نہ رہا اور قصد تشبہ کا یہاں ممکن نہیں۔ کیوں کہ کوئی مومن باوجود ہونے ہارِ گل عادات قوم اپنے سے، حالتِ نکاح شرعی میں کفار سے کیوں کر قصد تشبہ کا کرے گا۔ پس پھول کا ہار منکر نہ ٹھہرا اور موانع اجابت دعوت سے نہ رہا، تو اس کے سبب سے اجابتِ دعوت جو سنّت ہے یا مستحب ہے، ترک کرنا اور بعد حاضر ہونے کے اس کو نوشاہ کے گلے میں دیکھے تو نکلوانا والّا باوجود لزوم دعوت کے مجلس سے نکل جانا بے جا ہے۔"

جیسا کہ اسناد اس کے یہ ہیں:

"مولانا عبدالعزیز دہلوی اپنے فتاوی میں لکھتے ہیں:

"موافق قواعد شرع شریف چیزے کہ مخصوص بکفّار باشد مسلمانانِ آن را استعمال کنند خواہ در لباس، خواہ در چیزے دیگر بطریقِ اکل و شرب داخل تشبہ است و ممنوع و آن چہ مخصوص

بکفار نیست گو کہ کفار آن را بیشتر استعمال کنند و مسلمانان کمتر پس
مضائقہ ندارد ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔"
سید محمد عفا اللہ عنہ
اصاب من اجاب والمنازع مخطی بلا ارتیاب ۔ کتبہ عبدالوہاب عفی عنہ

اللطیف، ص۶۶، ۱۴۰۹ھ

حضرت مولانا مفتی سید محمد صاحب قادری کے مذکور فتوی سے متعلق عرض کرنے کی پہلی بات یہ ہے کہ اس کی تائید میں وقت کے مانے ہوئے جلیل القدر علمائے کرام نے اپنی اپنی رائے کے ساتھ دستخط کئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ حضرت مفتی صاحب نے اسناد میں حضرت مولانا عبدالعزیز دہلوی کا بیان پیش کرنے کے ساتھ ساتھ درالمختار اور ردّالمحتار، مرقاۃ، لمعات اور فتح القدیر کے بھی حوالے دئے ہیں۔ ہم نے اختصار کی غرض سے ترک کر دیا ہے جو حضرات تفصیل جاننا چاہیں "اللطیف" ملاحظہ فرمائیں۔

اس فتوے میں حضرت شمس العلماء عبدالوہاب قدس سرہٗ بانی باقیات صالحات کی تصدیقی دستخط موجود ہے۔ اور آپ نے اس کی تائید میں جو عبارت درج فرمائی ہے اس کا اردو ترجمہ اصل کے ساتھ حاضر ہے ۔ اَصَابَ مَنْ اَجَابَ والمنازع مخطی بلا ارتیاب : ترجمہ : جس نے جواب دیا ہے درست جواب دیا ہے اور اس میں جھگڑا کرنے والا بلا شک و شبہ خطا کار ہے اب اس بات سے کون مسلمان ناواقف ہے کہ عطر پھول اور خوشبو کا استعمال شریعتِ مطہرہ میں مسنون ہے ۔ اس پر مذکور فتوی میں ذکر کردہ حدیث خود دلیلِ واضح ہے ۔ بیسیوں دلائل کے باوجود بھی پھولوں کے ہار کی بات کسی کے سمجھ میں نہ آئے بس ہم ان بھائیوں کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں اور بس !

مختصرات

نعلینِ شریفین کی تعظیم

تعظیم کے مختلف طریقے ہیں۔ ہدایہ میں ہے کہ و یجمّر سریرہ

وترًا لما فیہ من تعظیم المیّت ہدایہ: ج ۱: ص ۱۵۸

یعنی مردہ نہلانے کے تخت کو ترا دھونی دی جائے اس لیئے کہ اس میں

میّت کی تعظیم ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس تخت پر میّت کو ابھی تک لٹایا نہیں

گیا ہے۔ صرف اس تصوّر میں کہ میّت کو اس تخت پر لٹایا جائے گا۔ دھونی دینا

میّت کی تعظیم میں داخل ہے۔

حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ قرآنِ پاک کو بوسہ دیا کرتے تھے اور قرآن

پاک کو اپنے چہرے سے مس کرتے تھے۔

شفاء قاضی عیاض میں ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ کو لوگوں نے

دیکھا کہ آپ نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے منبر پر جس جگہ حضورؐ تشریف فرما

ہوتے تھے وہاں پر اپنا ہاتھ رکھ کے ہاتھ کو اپنے منہ پر پھیرا کرتے تھے۔

مجھے بتانا یہ ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کے سینکڑوں

طریقے ہیں ان میں سے ایک آپؐ کے نعلینِ مبارک کے نقش مبارک کو چہرے سے ملنا، بوسہ دینا، سر پر رکھنا بھی آپؐ کی تعظیم میں داخل ہے۔ اس پر جلیل القدر علمائے کرام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ صاحبِ "سُنّی بہشتی زیور" لکھتے ہیں:

نعلینِ شریفین

"حضور سید البشر علیہ افضل الصلوٰۃ واکمل السلام کے نعلین (پاپوش) مطہر اور روضۂ معطّر کے نقشے دکانوں میں آویزاں کرنا، انہی عزّت وتکریم سے رکھنا، انہی بوسہ دینا، آنکھوں سے لگانا، سر پہ رکھنا یہ سب جائز ہے۔"

سُنّی بہشتی زیور: ص ۳۰۰

اس وقت اس پر طویل بحث کی گنجائش نہیں تاہم حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "زاد السعید" میں "نیل الشفاء بنعل المصطفیٰ" کے عنوان کے تحت نعلین شریفین سے متعلق جن جذباتِ عالیہ کا اظہار فرمایا ہے اور ان کی تعظیم سے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے، ملاحظہ فرمالیجئے۔

نَیلُ الشفا بِنَعلِ المصطفٰی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد الحمد والصلوٰۃ یہ ناچیز اشرف علی عرض کرتا ہے کہ ان دنوں ہم لوگوں کے کثرت معاصی سے جو کچھ ہجوم بلیات صوریّہ ومعنویّہ سے ظاہر ہے اس کا علاج بجز اصلاح اعمال وتوبہ واستغفار کے کچھ نہیں ہے۔ مگر ہم لوگوں کے قلب وزبان کی جو کیفیت ہے معلوم ہے البتہ

اگر کوئی وسیلہ قوی ہو تو اُس کی برکت سے حضورِ قلب بھی میسر ہو سکتا ہے۔ اور امید قبول بھی قریب ہے۔ منجملہ ان وسائل کے بتجربۂ بزرگان دین نقشۂ نعلِ مقدّس حضور سرورِ عالم فخرِ آدم صلی اللہ علیہ وسلم نہایت قوی البرکت، سریع الاثر پایا گیا ہے۔ اس لیئے اسلامی خیر خواہی باعث اس کی ہوئی کہ تمثال خیر النعال صلی اللہ علیہ صاحبہ فوق عدد الرمال حسبِ روایتِ امام زین الدین عراقی محدث مسلمانوں کی نذر کی جائے کہ اپنے پاس رکھ کر برکات حاصل کریں اور اس کے توسل سے اپنے حاجات و معروضات جناب باری تعالیٰ میں قبول کرائیں۔

اس نقشۂ شریف کے آثار و خواص و فضائل کو کون شمار میں لا سکتا ہے۔ مگر اس مقام پر نہایت اختصار کے ساتھ کتب معتبرۂ علمائے محدثین و محققین سے چند برکات اور کچھ ابیات مشتمل بر ذوق و شوق نقل کیئے جاتے ہیں۔ کہ جن کے پڑھنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعشق اور محبت پیدا ہو اور بوجہ غلبۂ محبت بلا تکلف آپ کا اتباع نصیب ہو جو اصل مقصود اور سرمایہ نجات دنیوی و اخروی ہے۔

طریق توسل

بہتر ہے کہ آخر شب میں اٹھ کر وضو کر کے تہجد جس قدر ہو سکے پڑھے۔ اس کے بعد گیارہ بار درود شریف، گیارہ بار کلمۂ طیبہ گیارہ بار استغفر اللہ پڑھ کر اس نقشہ کو با ادب اپنے سر پر رکھے اور بتضرع تمام جناب باری تعالیٰ میں عرض کرے کہ الٰہی میں جس مقدس پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشۂ نعلِ شریف کو سر پہ لیے ہوں ان کا ادنیٰ درجہ کا غلام ہوں الٰہی اس نسبت غلامی پہ نظر فرما کر ببرکت اس نعلِ شریف کے میری فلاں حاجت پوری فرمائیے مگر خلاف شرع کوئی حاجت طلب نہ کرے پھر سر پر سے اتار کر اپنے چہرے پر ملے اور اس کو محبت بوسہ دے اور اشعار ذوق وشوق بغرض ازدیادِ عشق محمدی پڑھے انشاء اللہ تعالیٰ عجیب کیفیت پائے گا . . . . اس نقش شریف کو ادب و احتیاط سے رکھیں مگر ایسا غلو نہ کریں کہ خلافِ شرع کوئی بات ہوجائے اور اس کو وسیلۂ برکت و محبت سمجھیں یہ نہیں کہ تمام احکام دین و اعمال خیر کو رخصت کر کے اسی پر کفالت کریں ۔

(ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی [illegible])

تسبیحاتِ تراویح و دُعا

اس پر بھی بڑی لے دے ہوتی ہے ۔ بعض پڑھے لکھے حضرات ہی اختلاف کو چھیڑ کر مسلمانوں کو آپس میں کئی مقامات پر لڑا بھی چکے ہیں ۔ حالاں کہ یہ مسئلہ محرمات یا شرکیات جیسا کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے ۔ فروعی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے ۔ اگر آج بھی ہم اپنے بزرگوں کے فتاویٰ پہ صحیح طریقے پہ عمل کرلیں تو سارے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں ۔ مزاجوں میں اعتدال چاہیے اور ایک پلاٹ فارم پر جمع ہونے کا جذبہ بھی اللہ تعالیٰ ہماری ہدایت فرمائے ۔

آئیے اب ہم مفتیانِ کرام کے فتاویٰ کا مطالعہ کرکے صحیح راہِ عمل اور عبرت ونصیحت حاصل کریں ۔

سوال

ہر چوتھی تراویح کے بعد دُعا مانگنی جائز ہے کہ مسنون ؟

الجواب

"تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد دعا مانگنا تسبیح وتہلیل و درود شریف پڑھنا جائز ومستحب ہے ۔ جو کچھ کرے بہتر ہے کسی خاص

امر کی ضرورت و تخصیص نہیں ہے لیکن تسبیح جیسے سبحان ذی الملک والملکوت الخ یا سبحان اللہ والحمد للہ ولا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھتے رہنا زیادہ اچھا ہے اور معمول اکابر ہے۔" فقط (فتاویٰ دار العلوم دیوبند: ج ۴: ص ۲۷۱)

کیا تسبیح و تہلیل و دعا کے جواز میں مزید وضاحت کی ضرورت ہے؟ نہیں مگر ہمیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پھر بھی بعض بھائی کہتے ہیں ہمیں دعا و تسبیح پر اعتراض نہیں ہے۔ جہراً تسبیح پڑھنے پر اعتراض ہے تو چلیے حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب کا فتویٰ پڑھ کر جہر کا بھی فیصلہ کر لیجیے اور اختلاف میں نہ پڑیے:

سوال

نمازِ تراویح کی ہر چار رکعت کے بعد تسبیح آواز سے پڑھنا کیسا ہے؟

الجواب

"تھوڑی آواز سے پڑھنا جب کہ اس پر اصرار و التزام نہ ہو جائز ہے۔ جہر پر اصرار کرنا مکروہ ہے۔"

محمد کفایت اللہ

کفایۃ المفتی: ج ۳: ص ۳۴۹

اب آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ "جائز ہے" والا جملہ کیا اختلافات کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں ہے خواہ تھوڑی آواز سے ہی سہی، کہاں

سرے سے تسبیح کو ہی ہمارا ناجائز بنانا اور کہاں حضرت مولانا کا تھوڑی آواز سے جائز ہے کہنا۔ فتاوی میں قیود کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ حضرت مولانا نے جہراً تسبیح پر اصرار کرنا مکروہ بتایا ہے۔ اگر اصرار نہ ہو تو بلا کراہت جائز ہے اور جن بزرگوں نے بلا کراہت جہراً تسبیح پڑھنا جائز بتایا ہے ذکرِ جہری پر قیاس کرتے ہوئے بتایا ہے جیسے ذکرِ جہری تمام حنفی علماء کے پاس جائز ہے بشرطیکہ نمازیوں اور سونے والوں کو تکلیف نہ ہو تسبیح جہری بھی جائز ہے تو پھر لڑنے کی کیا بات ہے۔ باقیات صالحات ویلور کے ہمارے اکثر جلیل القدر اساتذۂ کرام ویلور کی مسجدوں میں تراویح پڑھا کرتے ہیں جہاں تمام مساجد میں جہراً تسبیحات پڑھی جاتی ہیں، ہم نے کسی کو بھی منع کرتے نہیں دیکھا ہے۔

تشفیع الوتر

واجب الوتر کے بعد دو رکعت نفل نماز پڑھنے میں بھی اس بات پر اختلاف کیا جاتا ہے کہ آیا یہ دونوں رکعتیں بیٹھ کر پڑھیں یا کھڑے ہو کر! لہٰذا مفتیانِ کرام کے درج ذیل فتاوے غور سے ملاحظہ فرمائیے اور پھر خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ بزرگانِ دین نے ہمارے لیے نزاع سے بچنے اور ایک ہی مرکز پر جمع ہونے کے اسباب مہیّا کئے ہیں یا نہیں!

حضرت مولانا عبدالحی لکھنوئیؒ سے پوچھا گیا:

سوال

نفلِ مغرب و آں چہ بعدِ وتر میخوانند ایستادہ باید خواند یا نشستہ؟

الجواب

"نماز نفل ایستادہ خواندن ثواب زیادہ دارد و نشستہ ہم جائز است بے کراہت و دو رکعت بعد وتر نشستہ باید خواند کذا جاء فی الحدیث۔"

مجموعہ فتاوی: ج ۳: ص ۵۷

ترجمہ: نفل نماز کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے اور بیٹھ کر پڑھنا بھی بلا کراہت جائز ہے اور وتر کے بعد کے دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا چاہیئے۔ حدیث میں ایسا ہی آیا ہے۔

یہ حضرت مولانا عبدالحیؒ کا فتوی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا چاہیئے یہی نہیں یہ بھی لکھا ہے کہ حدیث میں ایسا ہی آیا ہے۔

اس کے باوجود بھی ہمارے بعض بھائی یہی کہتے ہیں کہ وتر کے بعد نفل کھڑے ہو کر پڑھنا چاہیئے اس لئے کہ نفل کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ حضرت مولانا لکھنوی نے وتر کی بعد والی دو رکعت نفل بیٹھ کر پڑھنے کا فتوی دیا ہے اور فرمایا کہ یہ حدیث سے ثابت ہے۔ لیکن نفل کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے کا ورد کرنے والے بھائی اگر وہی ہوں جو پگڑی کے بغیر نماز پڑھایا کرتے ہیں اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمام علماء اس بات پہ متفق ہیں کہ پگڑی کے ساتھ نماز پڑھانے میں ثواب زیادہ ہے تو

پگڑی کے ساتھ نماز میں ثواب کی زیادتی اُن کے پلّے نہیں پڑتی آخر کیوں؟
اب اس کیوں کا جواب وہی جانیں!
اب آپ وتر کے بعد والے دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے پر جو حدیث
"سفر السعادۃ" میں نقل کی گئی ہے پڑھ لیجئے: حضرت اُمّ سلمیٰ رضؓ سے مروی ہے

"کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یصلی بعد
الوتر رکعتین خفیفتین وھو جالس۔ مسند امام احمدؒ
سنن ابن ماجہ رشرح سفر السعادۃ ص۱۱۲
ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد ہلکی پھلکی
دو رکعت نفل نماز بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

نیز فتاویٰ دار العلوم دیوبند میں ہے:

"نوافل بیٹھ کر پڑھنا اگر کسی عذر کی وجہ سے پایا جاوے
تو جائز ہے اور متنفل قائم کے ساتھ ثواب میں برابر ہوگا۔ کما
فی جامع الرموز........ نفل بعد وتر اس سے مستثنیٰ
ہے۔ اس لیے وہ بحدیث قاعدًا ثابت ہے۔"
فتاویٰ دار العلوم؛ ج ۴: ص ۲۱۶

اور حضرت مولانا ثناء اللہ صاحبؒ پانی پتی لکھتے ہیں:

"وبعد وتر دو رکعت نشستہ خواندن مستحب است در رکعت اولیٰ اذا زلزلت الارض و در رکعتِ ثانیہ قل یا ایھا الکافرون خواند (مالا بد منہ)

ترجمہ: وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنا مستحب ہے۔ پہلی رکعت میں اذا زلزلت ارض اور دوسری رکعت میں قل یا ایھا الکافرون پڑھیں۔

مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتیٔ دارالعلوم دیوبند نے بھی فتاوی دارالعلوم دیوبند کی جلد چہارم میں صفحہ ۲۱۸ کے حاشیہ پر اس کا حوالہ دیا ہے مذکور فتاوی کی روشنی میں اب آپ ہی سوچیئے کہ وتر کے بعد دو رکعت بیٹھ کر پڑھنے والے حدیث پر عمل کر رہے ہیں یا کھڑے ہو کر پڑھنے والے۔!

مسجد میں اشیاء خوردنی کی تقسیم

حضرت مولانا شیخ آدم مفتیٔ اعظم باقیات صالحات ویلور مسجد میں روٹیاں کھانا، پیسے وغیرہ تقسیم کرنے سے متعلق لکھتے ہیں:

الجواب

"ھو الموصوب۔ جائز ہے بشرطیکہ سائل لینے والا مسجد میں لوگوں کو نہ اونگلے اور نمازی کے روبرو سے نہ گزرے اگر تخطی رقاب یا مرور بین یدی المصلی ہو تو اس کو دینا مکروہ ہے

سرورِ عالم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب بحرین سے مال آیا تو اس کو مسجد میں ڈالنے کا حکم فرمائے۔ جب آپؐ نماز سے فارغ ہوئے تو جس کسی کو آپؐ دیکھتے تھے اس کو اس مال سے دیتے تھے۔ حتیٰ کہ پورا مال بانٹ کر ہی وہاں سے تشریف لے گئے۔ (اس کے بعد بخاری اور درمختار کے حوالے ہیں: مرتب)

{دفتر فتاوی شیخنا: غیر مطبوعہ}

مسجد میں چندہ کرنا

"سلام پھیرنے کے بعد دعا مانگنے سے پیشتر کسی مذہبی کام کے لیے چندہ کرنا جائز ہے۔"

محمد کفایت اللہ کان اللہ لہ

کفایۃ المفتی: ج ۳: ص ۱۲۶

گیرو کے کپڑے!

بعض حضرات گیرو کے کپڑے استعمال کرنے والے صوفیائے کرام کا مذاق اڑاتے ہیں؟ انھیں مندرجۂ ذیل فتوٰی پڑھنا چاہیے۔

سوال

کپڑے گیرو میں رنگنا جیسے صوفی لوگ رنگتے ہیں کیسا ہے؟

الجواب

"گیرو میں کپڑا رنگنا درست ہے بشرطیکہ ریا نہ ہو فقط واللہ اعلم

رشید احمد گنگوہی فتاوی رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۳۱

تمباکو کا استعمال

بعض حضرات جو مسئلہ سے ناواقف ہیں، تمباکو کے استعمال کو مکروہِ تحریمی حرام وغیرہ کہتے ہیں۔ وہ اسی حد پہ رکتے نہیں بلکہ آگے بڑھ کر علماء سے دریافت کرنے کے بغیر خود ہی یہ مضحکہ خیز فیصلہ بھی کر دیتے ہیں کہ جب تمباکو کا استعمال حرام ہے تو اس کی تجارت بھی حرام اور نعوذ باللہ اس کے ذریعہ کمایا ہوا روپیہ بھی حرام۔ ان ناواقف حضرات کے تصوّرات کی عمارت ڈھانے کے لیے مندرجۂ ذیل سوال وجواب ملاحظہ فرمائیے۔

سوال

مسئلہ چہارم: حقّہ پینا، تمباکو کھانا یا سونگھنا کیسا ہے؟ حرام ہے؟ یا مکروہِ تحریمی یا مکروہِ تنزیہی ہے؟ اور تمباکو فروش کے گھر کا کھانا کیسا ہے؟

الجواب

"حقّہ پینا، تمباکو کھانا مکروہِ تنزیہی ہے اگر بو آوے ورنہ کچھ حرج نہیں۔ وحقّہ تمباکو فروش کا مال حلال ہے۔ ضیافت بھی اس کے گھر کھانا درست ہے۔ فقط"

فتاوی رشیدیہ: ج ۲: ص ۱۳

اس پہ مزید وضاحت کی حاجت نہیں ہے۔

مسجد میں ناس کا استعمال

"ھوالمصوب ... مسجد میں بیٹھ کر ناس لینا بشرطیکہ اجزاء اس کے مسجد میں نہ گریں مضائقہ نہ ہوگا۔ لیکن وہ ناس لیتے ہی ناک صاف کئے بغیر نماز شروع کر لیا اور ناس کے اجزاء نکیڑی سے دماغ میں چڑھے تو نماز فاسد ہونے کا اندیشہ ہے بلکہ فاسد ہوگی۔ امام کو چاہیئے کہ اس سے بہت احتراز کرے جیسا کہ درمختار کے مفسداتِ صوم میں لکھا ہے۔ .... کل ما یفسد به الصوم یفسد به الصلاۃ۔" انتہی

(دفتر فتاوی شیخنا مفتی باقیات غیر مطبوعہ: ۴۵)

سلام کے ساتھ ہاتھ اٹھانا

سوال: کسی کو السلام علیکم کہتے ہوئے ہاتھ اٹھانا کیسا ہے؟

الجواب

"حامداً ومصلیاً سلام کے ساتھ ہاتھ اٹھانے کی بھی گنجائش ہے۔ اگرچہ ضرورت نہیں۔" فقط حررہ العبد محمود گنگوہی

فتاوی محمودیہ: ج ۵: ص ۱۱۹

تلاوتِ قرآنِ پاک پر معاوضہ یا ہدیہ

سوال :

حافظ خواہ غیر حافظ اگر جائے تلاوت قرآن ساخت بے آں کہ اولاً چیزے دادنی با واقرار گرفتہ وپس از تلاوت شخصے بنظر تبرع واحسان چیزے بے مبادلہ با ودادہ آں را گرفتن واستعمال کردن وبمصرفِ خود آوردن جائز است یا نہ ؟

ترجمہ : حافظ ہو یا غیر حافظ کسی مقام پر تلاوتِ قرآنِ پاک کریں قرآن پاک کا معاوضہ طے کرنے کے بغیر اور تلاوت کے بعد کوئی شخص بلا معاوضہ احسان وتبرع کے طور انہیں کچھ دے دے تو اس کا لینا اور استعمال میں لانا جائز ہے یا نہیں ؟

الجواب

"ہیچ محظور شرعی دریں نیست واین صورت در ذیل آیۃ ولا تشتروا بآیاتی ثمناً قلیلا داخل نیست صاحبِ تفسیر مدارک در تفسیر خود می نویسد ولا تشتروا ولا تستبدلوا بآیاتی بتغیرھا وتحریفھا ثمنا قلیلا قال الحسن ھو الدنیا د ا فیرھا وقیل ھو الریاسۃ التی کانت لھم فی قومھم خافوا علیھا الفوات لو اتبعوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

ترجمہ : اس میں شرعاً کوئی ممانعت نہیں ہے اور یہ صورت ولا تشتروا بآیاتی ثمنا قلیلا کے ذیل میں داخل نہیں ہے ۔ صاحب تفسیر مدارک اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں :

> ولاتشتروا (یعنی) میری آیات میں تھوڑی سے دنیا کے لیئے تغیّر و تحریف کے ذریعہ تبدیلی مت کرو اور حسن نے کہا ہے کہ ثمن قلیل دنیا ہی ہے۔ اور ایک قبل میں ہے اس سے مراد قوم کی وہ سرداری ہے جو کفار مکہ کو حاصل تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے سے اس کے فوت ہوجانے کا انھیں خوف تھا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ تلاوتِ قرآن پاک پر کچھ معاوضہ طے نہ کیا جائے اور کوئی شخص اس پر ہدیۃً کچھ دے دے تو اس کا لینا اور اپنے استعمال میں لانا جائز ہے۔ قرآنِ پاک کی تعلیم پہ معاوضہ طے کرنے میں کوئی بحث نہیں ہے۔

عورتوں سے مصافحہ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند لکھتے ہیں:

> "جن عورتوں سے نکاح حرام ہے اُن سے مصافحہ اور دست بوسی کی جاسکتی ہے۔ شہوت نہ ہونی چاہیئے۔"
>
> مکتوباتِ شیخ الاسلام: ج ۴ : ص ۸۷

مطلب ظاہر ہے کہ جن عورتوں سے نکاح کرنا جائز ہے ان سے مصافحہ اور

دست بوسی دونوں ناجائز وحرام ہیں۔ آج کل حاجیوں کے استقبال کے لئے ہماری بہنیں ریلوے اسٹیشن پہنچنے لگی ہیں۔ اور شریعتِ مطہرہ کے خلاف مصافحے اور معانقے کرنے لگی ہیں۔ ہمارے بعض دین دار بھائی جمعہ اور عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ اور معانقہ کرنے پر لے دے کرتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس سے روکنے کی ہم کوشش نہیں کرتے۔ حالاں کہ اجنبی مردوں سے عورتوں کا مصافحہ معانقہ حرام ہے۔

قبر میں ڈھیلے

مسئلہ: بوقتِ دفن میت کے دُعا وغیرہ پڑھ کر چھوٹے چھوٹے ڈھیلے وغیرہ پہ دم کر کے قبر کے اندر رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔

الجواب

"کوئی حرج نہیں ہے جبکہ قبر میں جگہ نہ گھیرے۔ لعدم المنع ومالم یمنع لا یمنع۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

فتاوی رضویہ: ج ۴: ص ۱۶۱

ارواح دنیا میں آتی جاتی ہیں

انکشاف کے مصنفین "عوارف المعارف" کے حوالے سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"قیل الدنیا والآخرۃ عند الارواح سواء وقیل الارواح اقسام الارواح تجول فی البرزخ وتبصر احوال الدنیا والملائکہ وتسمع ماتتحدث بہ فی السماء فی احوال الآدمیین وروی سعید بن مسیب عن سلیمان قال ارواح المؤمنین تذھب عن برزخ من الارض حیث شاء بین السماء والارض	کہا گیا ہے کہ ارواح کے نزدیک دنیا و آخرت برابر ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ اس کی (یعنی روح کی) چند قسمیں ہیں بعض روحیں برزخ میں سیر کرتی ہیں اور دنیا اور ملائکہ کے احوال دیکھتی ہیں اور وہ ان باتوں کو بھی سنتی ہیں جو آدمیوں کے احوال کے بارے میں آسمان میں ہوتی ہیں سعید بن مسیب سلیمان سے روایت کرتے ہیں کہ مومنین کی روحیں برزخ ارضی سے جہاں چاہتی ہیں زمین وآسمان کے درمیان آتی جاتی ہیں ۔

عوارف المعارف: ج ۲: ص ۸۱؛ انکشاف: ص ۷

یہ عبارت نقل کرنے کے بعد مفتیانِ دیو بند نتیجے کے طور پر یہ تحریر فرماتے ہیں پوری توجہ کے ساتھ یہ اقرار نامہ پڑھنے کے قابل ہے ۔

"اب مذکورہ اثبات سے آپ بخوبی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ

کہ ارواح اولیاء کو کس قدر من جانب اللہ اختیارات ہیں "
انکشاف: ص ۷؛ زیر و زبر: ص ۴۳

اب آپ ہی سوچیے کہ جب عام مومنین کی ارواح کی قوت کا یہ عالم ہو تو انبیاءؑ اور اولیاء اللہؒ کی مبارک روحوں کا عالم کیا ہو گا؟

مُردے کے ذریعہ برزخ والوں کو سلام

سوال

بعض جگہ دستور ہے کہ جب مُردے کو نہلا کر کفن پہنایا جاتا ہے اس وقت اُس مُردے کے کان میں کہہ دیتے ہیں کہ میرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کہنا، یہ کیسا ہے؟

الجواب

" بعض سلف سے ثابت ہے کہ مردے کے ہاتھ برزخ والوں کو سلام کہلاتے تھے، اس بنا پر جائز ہے۔ مگر یہ اسی حالت میں ہو سکتا ہے جب مردہ بات سننے سمجھنے کے لائق ہو۔ یعنی موت کے قبل ہوش میں ہو نہ کہ بعد کفنانے کے کہ محض مہمل ہے "

امداد الفتاوی جدید جلد اول: ص ۷۲۹

سوچیے! خوب سوچیے! بیچارے بے بصیرت لوگ روحانی عالم کی وسعتوں کا اندازہ کیا لگا سکتے ہیں؟

مقابر سے پشت کئے بغیر واپسی

خاص طور پر بزرگوں کے مزارات پر زیارت کے لیے جانے والے لوگ مزار کی طرف پشت کئے بغیر مقابر سے نکلتے ہیں۔ اس پر بہت سارے لوگ پریشان ہوتے ہیں کہ یہ کس قسم کا ادب ہے؟ اس کو جاننے کے لیئے آپ امداد الفتادی کا سوال وجواب پڑھ لیں:

سوال: ۱۷

بندہ نے حضور سے دریافت کیا تھا کہ عوام لوگ مقابر سے نکلتے ہوئے ادباً پشت نہیں کرتے ہیں۔ آپ نے تحریر فرمایا کہ یہ ادب طبعی ہے یا اور بھی کوئی عقیدہ ہے۔ بندہ عرض کرتا ہے کہ صرف ادب طبعی ہے اور کوئی عقیدہ نہیں ـ بینوا توجروا ـ

الجواب

"اس حالت میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ ایسے عوام کے سامنے نہ ہو جن کے تجاوز عن الحدود کا احتمال ہو۔ والسلام"

امداد الفتاوی: جدید جلد اول: ص ۷۶۵

ایسا ادب کرنے والے مباح کام ہی کر رہے ہیں۔ ایسے میں ان پر اعتراض کر کے دلوں میں کدورتیں نہیں پیدا کرنی چاہیئے۔

میّت کا منہ دیکھنا: بعض مقامات پر لوگ نماز جنازہ سے پیشتر اعلان کرتے ہیں کہ میت کا دیدار کرنا چاہیئے

والے ابھی کرلیں۔ گویا نمازِ جنازہ کے بعد میّت کا منہ دکھنا جائز نہیں ہے بلکہ دکھاتے بھی نہیں۔ ان کی لاعلمی اور غلط فہمی کو درج ذیل سوال وجواب دُور کردے گا۔ اور بتادے گا کہ نمازِ جنازہ سے متصل ہی نہیں بلکہ میّت کو قبر میں لٹا دینے کے بعد بھی منہ دیکھنا درست ہے۔

السوال

منہ دیکھنا میّت کا قبلِ دفن کے گو قبر میں دیکھے درست ہے یا نہیں؟

الجواب

"منہ دیکھنا میّت کا گو قبر میں دیکھے قبل دفن کے دیکھے درست ہے۔ قال فی فتاوی عالمگیری ولا باس بان یرفع ستر المیّت عن وجہہ وانما یکرہ بعد الدفن انتہی وفی مدارج النبوۃ و واضح آنست کہ علی وعباس وفضل وقسم در قبر آمدند وبود قسم آخر کسے کہ برآمد از قبر واز وے می آرند کہ گفت آخر کسے کہ روئے مبارک آں حضرتؐ را دید در قبر من بودم۔ انتہی واللہ تعالیٰ اعلم

حررہ عبدالحی

الجواب صحیح : بندہ رشید احمد گنگوہیؒ

فتاوی رشیدیہ : حصّہ دوم : ص ۸۵

مُردوں کا ادراک و شعور

حضرت مولانا احمد رضا خان صاحب اس سوال کے جواب میں کہ قبر پر جانے سے کیا مردہ کو معلوم ہوتا ہے، تحریر فرماتے ہیں:

الجواب

"قبر پر جو کوئی جائے مُردہ دیکھتا ہے اور جو کچھ کلام کرے وہ سُنتا ہے اور جو ثواب پہنچائے مُردے کو پہنچتا ہے۔ اگر کوئی عزیز یا دوست جائے تو اس کے جانے سے مُردے کو راحت و فرحت ملتی ہے۔ جیسے دنیا میں۔ یہ سب مضامین صحاح احادیث میں وارد ہیں۔ وقد فصلناها فی حیاة الموات فی بیان سماع الاموات وفیه حکایة فی شرح الصدور: والله تعالیٰ اعلم

فتاوی رضویہ: جلد چہارم: ص ۱۶۳

حضرت مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ مزار پر جانے سے مردے کو راحت و فرحت ملتی ہے اور یہ زیارت قبور تو بالاتفاق تمام علماء کے پاس سنّت ہے۔ حضرت مولانا نے فرمایا ہے کہ یہ سب کچھ صحیح حدیثوں سے ثابت ہے شک کرنے والوں کے لیے کتاب کا حوالہ بھی دے دیا۔ اب ان بدعقیدہ لوگوں کا حشر کیا ہوگا جو مسلمانوں کو زیارتِ قبور سے روکنے کے پورے ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ روحانی طاقت سے لاعلم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں نیک توفیق عطا فرمائے۔

منکرِ کرامات

حضرت مولانا شاہ اسحاق صاحب لکھتے ہیں:

"منکر کراماتِ ولی عموماً از جملہ معتزلہ و مبتدع اسنن زیراکہ

برخلاف عقیدۂ اہلِ سنّت است۔ چنان چہ در کتب عقائدِ اہلِ سنّت مثل عقائد نسفی وغیرہ مرقوم ومسطوراست: "کرامۃ اولیاء اللہ حق" الخ

مائۃ السائل: ص ۱۹

ترجمہ: عموماً اولیاء اللہ کی کرامات کا انکار کرنے والے مبتدع معتزلہ ہیں۔ اس لیے کہ انکارِ کرامات اہلِ سنت کے عقیدہ کے خلاف ہے۔ چناں چہ اہلِ سنّت کے عقائد کی کتابوں مثلاً عقائد نسفی وغیرہ میں لکھا ہوا ہے کہ "کرامۃ اولیاء اللہ حق الخ

اس فتوے سے معلوم ہوا کہ اہلِ سنّت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اولیاء اللہ کی کرامات حق ہیں اور جو شخص اس کا انکار کرے وہ معتزلی (بدمذہب) ہے اور اہلِ سنّت والجماعت سے خارج ہے۔

سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدارِ خداوندی

سرکارِ کائنات کے اُن اُمتیوں کو ہم کس خانہ میں رکھیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّدالانبیاء بھی مانتے ہیں اور محبوبِ خدا بھی۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کے دیکھنے کا انکار کردیتے ہیں۔ حالاں کہ بڑے بڑے علمائے کرام نے اس کا اقرار کیا ہے۔

اس کے لیے آپ فتاوی رشیدیہ کا یہ سوال وجواب پڑھ لیں:

سوال

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ پاک کو دیکھا ہے یا نہیں؟

الجواب

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ پاک جلّ شانہٗ کو دیکھا ہے" فقط

فتاویٰ رشیدیہ: از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ: ج ۳: ص ۱۱۲

اگر آپ تفصیل چاہتے ہوں تو حضرت مولانا عبدالحق محدّث دہلویؒ کی کتاب "مدارج النبوۃ" کا مطالعہ فرمائیے۔

عبدالرسول، عبدالنبی نام رکھنا

افسوس ہے کہ ہم نے اپنے بچّوں کے نام عبدالرسول، عبدالنبی وغیرہ رکھنے میں آپس میں اختلافات کی خلیج کو اتنا بڑھا دیا ہے کہ جس کے ڈانڈے کفر و شرک سے ملنے لگے ہیں۔ یہی نہیں ایک فرقے نے تو بات اور بڑھا دی اور دعویٰ کیا ہے کہ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سیّدِ عالم نہیں کہنا چاہیئے یہ شرک ہے اس لیے کہ حدیث میں ہے: السید ھو اللہ وارد ہے۔ یعنی سید صرف اللہ ہے۔ اس پر حضرت مولانا اسماعیل شہید نے لکھا ہے

"سید کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ مالک و مختار ہو کسی کا محکوم نہ ہو۔ جو چاہے سو کرے۔ ان معنوں میں سوائے خدا

کے کسی کو سید کہنا درست نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ اور لوگوں سے ممتاز ہو۔ پس ان معنوں کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو سید کہنا اور جاننا ضرور ہے۔

پس یہ قاعدہ درست ہوا کہ الفاظ مشترکہ میں ارادہ شرط ہے۔"

جوہر الایقان فی حفظ الایمان از مولانا مفتی حکیم محمد عبدالکریم صاحب دہلوی

تو پھر مذکورہ قاعدہ کے مدنظر عبدالرسول اور عبدالنبی نام رکھنا کیوں کر شرک اور نادرست ہوگا؟ جب کہ لفظ عبد مشترک ہے۔ اس لیے کہ یہ لفظ بندہ اور غلام دونوں معنوں میں مستعمل ہے اور عبدالرسول نام رکھنے والے عبدالرسول کے معنے غلام رسول' رسول کا غلام لیتے ہیں۔ یہ لفظ بندۂ رسول کے معنے میں جاہل سے جاہل آدمی بھی بولے گا نہیں۔ وہم کا علاج تو کسی کے پاس نہیں ہے۔

" ازالۃ الخفاء" میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک قول مذکور ہے: حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فقد کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فکنت عبدہ وخادمہ

ترجمہ: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تھا تو آپ ﷺ کا غلام اور خادم تھا۔ مذکور قول میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عبدہ فرمایا ہے اگر کوئی صاحب اس کے معنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بندہ لے لیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ خدا بنا دیں تو یہ ان کی قابلیت ہوگی۔ پھر انھیں خود توبہ کرنا چاہیئے۔

یہی نہیں قرآن پاک میں ہے وانکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم واِمائکم

ترجمہ: اور تم میں جو بے نکاح ہوں تم ان کا نکاح کر دیا کرو اور (اسی طرح) تمہارے غلام اور لونڈیوں میں سے جو نکاح کے لائق ہیں اس کا بھی۔ اس آیتِ شریفہ میں عبادکم کے معنے تمہارے غلام ہی کے تو ہیں۔

بہر حال بندۂ عاصی کا منشا یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل میں کوئی بھی ایک ایسا گوشہ مل جائے جہاں دونوں فریق مل بیٹھ سکتے ہوں تو کیوں نہ بیٹھا جائے اور مسلمان بھائیوں کو آپسی نزاع سے کیوں نہ بچایا جایا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بھی شمائم امدادیہ میں فرماتے ہیں کہ عباد اللہ کو عباد الرسول کہہ سکتے ہیں۔ آپ کے اس قول سے صاف معلوم ہو گیا کہ عبدالنبی نام رکھنا جائز ہے فہو المراد

حضرت یوسف علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام و زلیخا رضی اللہ تعالیٰ عنہا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بعض بھائی شاید ہنگامے جاری رکھنے کے لیے کوئی نہ کوئی مسئلہ پیدا ہی کر لیتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے کہ ہم بچپن سے نکاح کی مجلسوں میں قاضی صاحب کو دعا میں اللّٰھم الف بینہما کما الفت بین یوسفؑ و زلیخا رضؓ پڑھتے ہوئے سنتے آرہے ہیں۔ پتہ نہیں کتنے سو سالوں سے یہ سلسلہ چل رہا ہے۔ بڑے بڑے علمائے کرام دعا میں یہ جملہ استعمال کرتے ہیں۔ مگر اب چند بھائیوں کو اچانک الہام ہو گیا ہے کہ یوسف علیہ السلام اور زلیخا رضی اللہ عنہا کا نکاح نہیں ہوا ہے۔ لہٰذا دعا میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر بڑے ہنگامے کھڑے کیے اور اب بھی یہ نیک کام بعض لوگ جاری رکھے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو مختلف فرقوں اور   میں تقسیم کر کے نامعلوم طور پر دشمنانِ اسلام

کے آلہ کار بن رہے ہیں۔ جو ہر گز ہر گز نہیں چاہتے کہ مسلمان متفق و متحد رہیں
حضرت یوسف ؑ اور زلیخا رض کے نکاح کا تاریخی ثبوت نہ ہونا بھی ایک بات تھی
الحمدللہ اس کا تاریخی ثبوت جلیل القدر علمائے کرام نے پیش فرمایا ہے۔ حوالے ملاحظہ
فرمائیے۔

پہلی بات تو یہ کہ ہم اپنے جتنے بھی جلیل القدر اساتذۂ کرام کو ویلور اور ویلور کے اطراف واکناف کے شہروں اور گاؤں میں نکاح پڑھاتے دیکھا اور سنا ہے، وہ دعا میں حضرت یوسف ؑ اور زلیخا رض کا نام لیا کرتے تھے۔

دوسری بات یہ کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح نے اپنی تفسیر "تفسیر بیان القرآن" میں لکھا ہے کہ زلیخا رض سے حضرت یوسف ؑ کا نکاح ہو گیا۔ افسوس ہے کہ اس کا قدیم نسخہ میرے پاس نہیں ہے۔ میں نے اس کا مطالعہ میری مادرِ علمی باقیات صالحات کے کتب خانہ میں کیا تھا۔ اب مجبوراً تاج کمپنی لمیٹڈ سے چھپے ہوئے قرآنِ حکیم کے حاشیہ سے نقل کر رہا ہوں۔ لکھتے ہیں:

> "اور درِّ منثور میں منقول ہے کہ عزیز اسی زمانہ میں مر گیا اور زلیخا سے یوسف کا نکاح ہو گیا۔"
>
> تفسیرِ بیان القرآن بر حاشیۂ قرآنِ حکیم۔ سورۂ یوسف

اس مقام پر آپ کو ایک بات بتانا بہت ضروری ہے کہ حضرت مولانا تھانوی رح نے اپنی تفسیر میں جہاں یہ عبارت لکھی ہے "زلیخا رض سے حضرت یوسف کا نکاح ہو گیا" لفظِ زلیخا پر رض کی علامت لگائی ہے۔ لیکن تاج کمپنی لمیٹڈ سے چھپے ہوئے

قرآنِ حکیم کے حاشیہ میں لفظ زلیخاؓ پر رضا غائب ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کاتب صاحب نے غلطی سے چھوڑ دیا ہو مگر رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اختصار لفظ زلیخاؓ پر بڑا معنی خیز ہے اور ان بے ادبوں کے لیئے جو حضرت زلیخاؓ کی شان میں گستاخانہ جملے استعمال کرتے ہیں تازیانۂ عبرت ہے۔

اب آپ علامہ جلال الدین سیوطیؒ کا یہ بیان ملاحظہ فرمائیں:

> "فزوجه امرأته زليخا فوجدها عذراء وولدت له ولدين"
>
> تفسیر جلالین: سورۂ یوسف: ص ۱۹۴
>
> ترجمہ بادشاہ نے عزیزِ مصر کی بیوی زلیخاؓ کا نکاح یوسفؑ کے ساتھ کردیا۔ یوسفؑ نے زلیخاؓ کو باکرہ پایا اور زلیخاؓ کو حضرت یوسف سے دو بچے بھی ہوئے۔

تفسیر جلالین کی تالیف پر چھ سو سال سے زاید گزر گئے ہیں۔ گویا زلیخاؓ سے یوسفؑ کے نکاح کی تصدیق ہمارے معلومات کے پیش نظر چھ سو سال سے آگے ہی کی گئی ہے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں:

> "بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی زمانے میں زلیخاؓ کے شوہر قطفیر کا انتقال ہوگیا تو شاہِ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی شادی کردی، اس وقت یوسف علیہ السلام نے اُن سے فرمایا یہ صورت اُس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں۔ زلیخاؓ نے اعترافِ قصور کے ساتھ اپنا عذر بیان کیا۔ اللہ جل شانہٗ نے بڑی عزت و شان کے ساتھ

ان کی مراد پوری فرمائی اور عیش ونشاط کے ساتھ زندگی گزری تاریخی روایات کے مطابق دو لڑکے بھی پیدا ہوئے جن کا نام افرائیم اور منشا تھا۔

تفسیر معارف القرآن : سورۂ یوسف: ص ۱۱

مذکور معتبر حوالوں کی روشنی میں سوچیے اچھی طرح سوچیے کہ جن کی نگاہوں میں حضرت علامہ جلال الدین سیوطیؒ، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا ہی کوئی مقام نہ ہو اور انھیں تاریخ پر بھی بھروسہ نہ ہو تو ہم جیسے طالب علم کیسے سمجھا سکتے ہیں؟ نہیں سمجھا سکتے البتہ دعا کر سکتے ہیں اور بس!

آخر میں معذرت خواہ ہوں کہ اسباب ووسائل کی کمی اور وقت پر مختلف کتابوں کی عدم دستیابی کی وجہ سے کتاب میں بہت ساری بحثیں تشنہ رہ گئی ہیں۔ تاہم اصحابِ بصیرت کے لیے امتِ مسلمہ کا درد اپنے سینہ میں رکھنے والوں کے لیے اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ پر گامزن ہونے کا کافی سامان موجود ہے۔

دعا کیجیے کہ خالق کائنات دنیا میں سلامتی اور آخرت میں فلاح و نجات سے نوازے۔ بحق النبی الامی صلی اللہ علیہ وسلم۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

خواب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار

خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے متعلق ایک نشست میں بات چھڑی تو جناب کاتب محمد شریف برکاتی صاحب نے یہ سُنا کر مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ بعض بھائی اس کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ تو میں نے عرض کیا کہ اس کا انکار تو صحیح مسلم کی حدیث شریف کا انکار ہے۔ حدیث شریف یہ ہے: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من رانی فی المنام فقد رأنی فان الشیطان لا یتمثل بی (صحیح مسلم شریف) ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بھی شخص مجھے خواب میں دیکھے گا وہ مجھے ہی دیکھا ہوگا۔ اس لئے کہ بلاشک وشبہ شیطان میری شباہت میں آ ہی نہیں سکتا

بعض حضرات یہ اشکال بھی پیش کرتے ہیں کہ بیک وقت بیسیوں افراد کے خواب میں کیسے آ سکتے ہیں؟ تو ہم تفصیل میں جانے کے بغیر آپ حضرات سے اتنا عرض کر دیں گے کہ آپ بلاتشبیہ ٹیلی ویژن پر بتائے جانے والے اس مقرّر کا تصوّر کرلیں جو ہزاروں لاکھوں مقامات پر دیکھا جاتا ہے۔

یہ تو خواب کی بات ہے۔ قبر میں جب منکر و نکیر میّت سے سوال کریں گے جیسا کہ بخاری شریف میں ما تقول بهذا الرجل یعنی اس ذات مقدس سے متعلق کیا کہتے ہو؟ تو حضورؐ کو میّت دیکھے گی۔ کیسے دیکھے گی؟ تو حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بتایا ہے کہ قبر سے روضۂ اقدس تک تمام حجابات اٹھا دئے جائیں گے۔

مزید تفصیل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

واللہ اعلم ٥